حالات وواقعات

تالیف
خلیل احمد نینی تال والا

حالات وواقعات
خلیل احمد نینی تال والا

خلیل احمد نینی تال والا

حالات وواقعات

خلیل احمد نینی تال والا

قیمت :۔ =/300 روپے

پبلیشر :۔ ہمدرد پریس پرائیویٹ لمیٹڈ

ڈیزائن وکتابت :۔ دی لیزر ڈاٹ پرائیویٹ لمیٹڈ

انتساب

ان معذورں بچوں کے نام جو دارالسکون ''کشمیر روڈ
کراچی میں ہماری توجہ کے منتظر ہیں۔''

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کتاب سے ہونے والی
تمام آمدنی میں نے انہی معذور بچوں کے ادارے دارالسکون
کیلئے وقف کر دی ہے۔

نمبر شمار		فہرست مضامین	صفحہ نمبر
		انتساب	
		تعارف	
1	09-06-2000	ایک انقلابی فیصلہ	1-4
2	15-06-2000	نواز شریف یو۔ٹو (You Too)	5-7
3	22-06-2000	یہ بجٹ کس کا ہے	8-10
4	30-06-2000	ہمارے چھپے خزانے ہمارے منتظر ہیں	11-13
5	07-07-2000	پاکستان سے غیر ملکی ایئر لائنز کا انخلاء	14-17
6	21-07-2000	سیاسی ٹوٹی فروٹی	18-20
7	28-07-2000	نو ماہ کے مسائل کو کون ہوا دے رہا ہے؟	21-24
8	03-08-2000	مسلم لیگ کا فیوچر	25-28
9	11-08-2000	حکومت کے دس (10) ماہ کی کارکردگی	29-32
10	17-08-2000	حجاج کرام کا سنگین مسئلہ	33-36
11	25-08-2000	ہیومن رائٹ والوں سے ایک سوال	37-39
12	08-09-2000	ایک اور قائداعظم کی تلاش	40-42
13	15-09-2000	پیٹرول کا عالمی بحران	43-44
14	22-09-2000	امریکہ میں ایک خطیب کا کارنامہ	45-48
15	29-09-2000	علامہ اقبال کے اشعار گردش میں	49-51
16	06-10-2000	خزانوں کے عزیز	52-55
17	13-10-2000	سڈنی اولمپکس اور ہماری شکست	56-58
18	20-10-2000	اللہ خیر کرے	59-62
19	27-10-2000	بیچارہ شہید	63-65

نمبر شمار		فہرست مضامین	صفحہ نمبر
20	03-11-2000	ایک کلو آٹا، ایک کلو واٹ بجلی ایک دام	66-68
21	08-11-2000	کچھ تبصرے آپ کی خدمت میں	69-72
22	17-11-2000	یہ ہفتہ کیسا رہے گا؟	73-76
23	23-11-2000	ہاتھوں سے گنتی اور ہم خیال گروپ	77-80
24	01-12-2000	بیماریاں اور ان کا علاج	81-84
25	08-12-2000	ظلمتوں کے پہاڑ	85-88
26	14-12-2000	الوداع اے احتساب الوداع	89-91
27	26-12-2000	یہ کیسی شرمندگی ہے؟	92-96
28	05-01-2001	عمرہ کے فضائل، وسائل اور مسائل	97-100
29	19-01-2001	اندھیرا بڑھ رہا ہے	101-102
30	02-02-2001	دوہری پریشانی	103-105
31	09-02-2001	قارئین کے اعتراضات	106-108
32	16-02-2001	سلی کوئچن (بیوقوفی کا سوال)	109-111
33	24-02-2001	بڑے بول کا انجام	112-115
34	02-03-2001	وزارت حج اور مذہبی امور دو ارب روپے کا حساب دے	116-119
35	09-03-2001	اسامہ بن لادن کون ہے؟	120-122
36	16-03-2001	ہم خیال یا بے خیال	123-125
37	01-04-2001	چوکھٹ بدل لیجئے	126-129
38	06-04-2001	جب ہم مقروض نہیں تھے	130-133
39	19-04-2001	خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا	134-139
40	29-04-2001	اے آر ڈی کا جلسہ	140-143

نمبر شمار		فہرست مضامین	صفحہ نمبر
41	11-05-2001	ٹی وی چینلوں کی یلغار	144-147
42	18-05-2001	خوشحال پاکستان کیسے ممکن ہے	148-151
43	25-05-2001	ٹھنڈا کالم	152-155
44	01-06-2001	خدا کے لئے اب تو سوچیں	156-159
45	08-06-2001	سانپ کے منہ میں چھچھوندر	160-163
46	14-06-2001	نئے عمرہ پیکج کے لئے چند تجاویز	164-167
47	22-06-2001	س۔ش۔عزیز	168-171
48	06-07-2001	آخری نماز	172-174
49	12-07-2001	بلدیاتی نظام کس کے تابع ہوگا	175-177
50	20-07-2001	ہندوستان کو ایک ڈیگال کی ضرورت ہے	178-181
51	27-07-2001	بوڑھی ماں	182-184
52	25-12-2001	اوپر کا بٹن	185-188

تعارف

محترم قارئین

اسلام علیکم

تمام گذشتہ تصانیف ''شگوفہ نو'' اور ''گردشِ ایام'' کی زبردست پزیرائی کے بعد میں نے اپنے کالموں کا سلسلہ جو جنگ اخبار میں وقتاً فوقتاً چھپ رہے ہیں جاری رکھا اور ان کالموں کے مجوعے کو ایک تیسری کتاب ''حالات وواقعات'' کی شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ انشا اللہ جب تک میرے کالموں کا سلسلہ جاری رہے گا میں اسے کتابی شکل میں اپنے قارئین کے لیے ترتیب وار شائع کرتا رہوں گا۔

اس کتاب میں بھی میری سابقہ تصانیف کی طرح ۵۲ کالم شامل ہیں۔ امید ہے قارئین میری اس کاوش کو سراہیں گے۔ میری سابقہ تصانیف کی طرح اس کتاب کی تدوین واشاعت میں بھی مجھے جناب سلیم مرزا چیف ایگزیٹو ہمدرد پریس پرائیوٹ لمیٹڈ کا مکمل تعاون حاصل رہا ہے۔ میں ان کا مشکور ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو خوبصورت بنانے میں تمام تر وسائل اختیار کرتے ہوئے اسے تکمیل کے مراحل تک پہنچایا۔

اسی طرح میں ان صاحباب جناب محبّ احمد خان صاحب. جناب حیدر علی صاحب اور ہمدرد کے جناب سید ندیم الرحمن صاحب. صدیق حیدر اور خلیق خان صاحب کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے اس کی تیاری اور تصیح وطباعت میں مکمل ماونت کی۔

خلیل احمد نینی تال

09th June, 2000

ایک انقلابی فیصلہ

تاجروں کی ہڑتال کو آج پندرہ دن ہوگئے ہیں اور حکومت ٹیکس سروے کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ اگر ہڑتال چند دن اور جاری رہی تو کارخانے بھی بند ہونا شروع ہوجائیں گے۔ کیونکہ ایک طرف ہڑتال کی وجہ سے کارخانوں سے پندرہ دن سے کوئی مال نہیں جارہا ہے اور دوسری طرف خام مال اور پیکنگ میٹریل بھی ختم ہونے کو ہے، تاجروں نے ادائیگیاں روک دی ہیں، کارخانے بند ہونا شروع ہوگئے ہیں، ایکسپورٹ کے آرڈر کینسل (Cancel) ہورہے ہیں۔ بھارتی تاجر اس ہڑتال پر خوش ہیں کہ ان کا حریف مال سپلائی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ غالباً اس نئے ٹیکس سروے سے حکومت کو 100 ارب روپے کی آمدنی متوقع تھی جو نئے ٹیکس دہندگان سے وصول کرنا تھی۔ مگر 15 دن کی ہڑتال سے اب تک محتاط اندازے کے مطابق 60 ارب روپے کا نقصان ہوچکا ہے اور اگر ہڑتال جاری رہی جو کہ نظر آرہی ہے تو 100 ارب روپے وصول کرنے کے بجائے ہم 100 ارب روپے مزید گنوا بیٹھیں گے۔ یعنی کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا سو ارب روپے کا۔

اگر ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے دباؤ سے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں صرف انکم ٹیکس دہندگان بارہ لاکھ ہیں تو یہ غلط اعداد وشمار ہیں۔ آپ حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارا شیر خوار بچہ بھی انکم ٹیکس دیتا ہے کیونکہ وہ جو دودھ پیتا ہے وہ غیر ممالک سے درآمد ہوتا ہے اور وہ جیسے ہی ہمارے ملک پہنچتا ہے دیگر ٹیکسوں کے علاوہ پورٹ پر 5 فیصد انکم ٹیکس وضع کرلیا جاتا ہے۔ ایک غریب سے غریب آدمی بھی انکم ٹیکس سے مستثنیٰ نہیں جو چائے ہم درآمد کرتے ہیں وہ غریب آدمی بھی پیتا ہے۔ چائے ہمارے ملک میں نہیں پیدا ہوتی۔ وہ بھی باہر سے درآمد کی جاتی ہے۔ اس پر بھی پورٹ پر انکم ٹیکس کاٹ لیا جاتا ہے۔ الغرض ہر

چیز جو پاکستان میں درآمد کی جاتی ہے 35 فیصد سے 50 فیصد تک اس پر امپورٹ ڈیوٹی ادا کر کے ہی اور اس ڈیوٹی پر بھی انکم ٹیکس پانچ فیصد لگتا ہے کہ اسی طرح پاکستان میں بننے والی چیز کے کارخانے سے سی ای ڈی اور سیلز ٹیکس دونوں الگ وصول کئے جاتے ہیں تو یہ ثابت ہوا کہ ماچس سے لے کر موٹر گاڑی تک درآمدی ڈیوٹی، جنرل سیلز ٹیکس، انکم ٹیکس پہلے ہی عوام سے وصول کر لیا جاتا ہے کہ اور یہ قیمت فروخت میں شامل ہو جاتا ہے تو کون کہتا ہے کہ ہمارے عوام ٹیکس نہیں دیتے ہیں یہی حال کھانے پینے کی اشیاء اور پیکنگ میٹیریل کا ہے۔ جن میں بھی انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس اور امپورٹ ڈیوٹی شامل ہوتی ہے اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ یہ کس کھاتے میں جاتا ہے۔ البتہ یہ چودہ کروڑ عوام ہی کے اوپر لاگو ہوتا ہے یہ ٹیکس تو حساب لگا لیجئے کہ کون بندہ بشر اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

پاکستان میں تو گھر میں پالے جانے والے پالتو جانور کتے، بلی، مچھلیاں اور مرغیاں تک اس ٹیکس سے مبرا نہیں ہیں کیونکہ ان کی خوراکیں بھی باہر سے آتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے کھیتوں میں جو کھاد اور دوائیاں ڈالی جاتی ہیں ان پر بھی درآمد کی شکل میں تمام ٹیکس لاگو ہوتا ہے جو کہ کسانوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

تو ثابت یہ ہوا کہ ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں کھانے، پینے، اوڑھنے اور رہنے میں ٹیکس ادا کر رہا ہے۔ یعنی ہر چیز جو درآمد کی جاتی ہے اس پر پورٹ پر پانچ فیصد انکم ٹیکس کاٹ کر ہی پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتی ہے اور جب وہ فروخت کی جاتی ہے تو اس قیمت فروخت میں انکم ٹیکس لگا کر فروخت کی جاتی ہے تو کون کہتا ہے کہ صرف بارہ لاکھ انکم ٹیکس دہندگان ہیں۔ پوری دنیا میں انکم یعنی آمدنی کے بعد انکم ٹیکس لگتا ہے۔ مگر ہمارا عام شہری تو انکم کے بغیر ہی انکم ٹیکس دے رہا ہے اور اب تو حکومت نے تمام روزمرہ کے بلوں یعنی گیس، بجلی، پانی اور ٹیلی فون کے بلوں پر ایڈوانس انکم ٹیکس لگا دیا ہے، اسی طرح تمام تجارتی اداروں کے لین دین پر بھی ایڈوانس پانچ فیصد انکم ٹیکس وصول کر کے حکومت کے خزانوں میں جمع کروایا جاتا ہے ہر شہری ملازم جو پانچ ہزار روپے سے زیادہ تنخواہ لیتا ہے، اس پر انکم ٹیکس کی کٹوتی ہوتی ہے۔ بارہ لاکھ تو ڈائریکٹ انکم ٹیکس دینے والے رجسٹرڈ ادارے ہیں۔

میں جنرل پرویز مشرف صاحب کو ایک انقلابی مشورہ دینا چاہتا ہوں اگر ان کے رفقاء اس پر غور کریں تو پاکستان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ مشورہ نیا نہیں ہے، آزمودہ ہے صرف خلوص دل سے اس پر عمل کرنے کی

ضرورت ہے یہ واقعہ آج سے تقریباً تیس سال پہلے سنگاپور میں اس وقت کے وزیراعظم مسٹر لی نے جب اقتدار سنبھالا تو پاکستان کی طرح وہاں بھی سیاست دان، تاجر، بیوروکریسی کرپشن میں ملوث تھی۔ ٹیکسوں کی بھرمار تھی، گلی گلی سنگاپور جیسے چھوٹے ملک میں غنڈہ گردی بھی عام تھی۔ بڑی بڑی مافیاؤں کا زور تھا۔ پولیس بے بس تھی۔ وزیراعظم لی نے ایک ہفتے تک اپنے تمام وزراء، رفقاء، صنعت کار، بیوروکریسی سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد کرپشن کے خاتمے کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا کہ جو صنعت کار، تاجر، سیاستدان، بیوروکریٹ اپنی اپنی تمام جائیداد روپیہ پیسہ ڈیکلیئر (Declare) کر دیں اس پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ وہ ان کا اپنا سمجھا جائے گا۔ صرف سادے کاغذ پر اس کی تفصیل لکھ کر حکومت سے تصدیق کرانی ہوگی تاکہ وہ سند رہے، البتہ اگر آئندہ کسی نے پھر ٹیکس چوری کیا تو یہ تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی جائے گی اور انکم ٹیکس کی شرح صرف پندرہ فیصد کر دی تھی۔ سرکاری اداروں اور عدلیہ کی تنخواہوں میں اس وقت کی مہنگائی کے لحاظ سے تین سے پانچ گنا اضافہ کر دیا تاکہ بیوروکریسی رشوت کیطرف نہ جائے۔ سب سے زیادہ تنخواہوں میں اضافہ پولیس اور عدلیہ میں کیا گیا۔ عوام کی سہولتوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس اسکیم (عام معافی) سے کھربوں غیر ملکی ڈالر اور ملکی سنگاپوری ڈالر بینکوں میں جمع ہو گئے۔ سنگاپور غیر ملکی قرضوں سے آزاد ہو گیا اور اس چھوٹے سے ملک کا بجٹ پاکستان کے بجٹ سے پچاس گنا بڑا ہے، ہر بڑی کمپنی کا دفتر آج سنگاپور میں لازمی سمجھا جاتا ہے۔

اگر آپ آج عام معافی کا اعلان کر دیں تو تمام سیاست دان، صنعت کار، تاجر، بیوروکریسی جیسا کہ سنگاپور میں تجربہ کیا گیا تھا۔ اس تجربے کو ہمارے پاکستان میں دہرائیں۔ نیب تو صرف بارہ ارب روپے نو مہینوں میں وصول کر سکی ہے، تمام سیاست دانوں، صنعتکاروں کو قید سے چھوڑیئے۔ جہاں جہاں ان کا پیسہ ہوگا وہ پاکستان واپس لے آئیں گے سزاؤں سے ہمارا قرضہ ادا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک پلڑے میں یہ کرپٹ سیاست دان، تاجر، بیوروکریٹس، صنعتکار ہوں اور دوسرے پلڑے میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک ہوں تو ان میں مجھے یہ کرپٹ پاکستانی قبول ہیں۔ اگر ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے جان چھڑا لیں تو یہ سب سے بڑی جیت آپ کی حکومت کی ہوگی۔ ٹیکسوں کی بھرمار نے ہماری قوم کو کرپشن پر مجبور کیا ہے، آج کی مہنگائی کے مطابق بیوروکریسی کی تنخواہوں بالخصوص پولیس اور عدلیہ میں زبردست اضافہ ناگزیر ہے، ہم کب تک انتقامی یا دھونس سے حکومت کرتے رہیں گے۔ نئے نئے ٹیکس لگانے کے بجائے ہم کو ٹیکس کم کرنے ہوں گے۔ ایک

عام معافی کا آرڈیننس اس ملک کی تقدیر کو بدل دے گا۔ سب کو مل کر پاکستان کی بقاء اور سلامتی کے لئے خلوص دل سے کام کرنا ہوگا اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے لئے سہولتیں میسر کرے۔ پاکستانی صنعت کاروں کے لئے جنت سے کم نہیں ہے۔ اگر عام معافی دی گئی اور اس کے عوض بھی کوئی ٹیکس نہیں لیا گیا تو کون بیوقوف ہوگا جو ملک یا غیر ممالک میں اپنی دولت کو چھپائے گا۔ ڈالروں اور غیر ملکی کرنسیوں کی بھرمار ہوگی۔ ذرا حساب تو لگائیے ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو اب تک کتنا سود دے چکے ہیں۔ اگر آپ حساب کریں گے تو اصل سے زیادہ ہم ادا کر چکے ہیں اور اصل آج بھی ہمارے سروں پر تلوار کی طرح لٹکا ہوا ہے، ہماری غیرت تو ورلڈ بینک میں گروی رکھی ہوئی ہے، صرف غیرت کو جگانے کی ضرورت ہے، آپ محبّ وطن ہیں اور قوم کو اپنی افواج پر ناز ہے، پیار محبت سے اس مسئلہ کا فوری حل نکالیں۔ سنگاپور کی تقلید کر کے تو دیکھیں۔ آج مسٹر لی کو سنگاپور کا نجات دہندہ بابائے سنگاپور کہا جاتا ہے۔

چلتے چلتے اسلامی تاریخ کے ایک باب کا حوالہ دوں گا۔ اگر ہمارے پیغمبر ﷺ فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان نہ کرتے تو آج مسلمان جو دنیا کے چپہ چپہ میں پھیل چکے ہیں صرف مکہ تک ہی محدود رہتے۔

نواز شریف یو۔ٹو (You Too)

تین ہم سفر جن میں روسی، جاپانی اور پاکستانی اپنے اپنے ملک کے کارنامے سنا رہے تھے۔ پہلے روسی نے بتایا کہ ہمارے ملک میں سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایک آدمی کا دایاں ہاتھ ضائع ہو گیا ہم نے اس ہاتھ کو کاٹ کر مصنوعی ہاتھ لگایا اور اس شخص نے اولمپکس میں سب سے زیادہ دور نیزہ پھینکنے کا ریکارڈ قائم کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ جاپانی نے کہا یہ بھی کوئی ترقی ہے ہم نے تو ایک مشین کا مکمل انسان روبوٹ بنایا وہ دس انسانوں سے زیادہ کام کرتا حتیٰ کہ اب گاڑیوں کے ایک ایک پرزے خود جوڑ کر مکمل گاڑی بنا دیتا ہے اور اب بڑی بڑی فیکٹریاں انسانوں کے بغیر یہی مصنوعی انسان روبوٹ چلا رہے ہیں۔ پاکستانی سے نہیں رہا گیا کہنے لگا یہ بھی کوئی ترقی ہے ہم نے ایک شخص جس کے پاس دماغ نہیں تھا اس کے سر کی جگہ ایک ناریل لگایا اور دن رات اس کو بکری اور گائے کے مغز کھلائے آج وہ ہمارے ملک کا وزیر اعظم ہے اور پورے ملک کو چلا رہا ہے۔ کہنے کو تو یہ حکایت لگتی تھی مگر آج جب ہمارے سابق وزیر اعظم نواز شریف صاحب نے کارگل کے بارے میں جو انکشافات کئے قوم دم بخود رہ گئی جو زبان انہوں نے ایک سال بعد کھولی اور اس بری طرح فوج کی ٹوپی اچھالی وہ بھارتی اور امریکی میڈیا بھی ایک سال میں نہیں کر سکی جو انہوں نے چند منٹ میں کر ڈالی۔ اردو ڈکشنری میں ایسے شخص کے لئے غدار کا لفظ بہت چھوٹا لگتا ہے۔ اس سے بڑا لفظ مجھے نہیں مل سکا اگر آپ کو ملے تو قوم کو ضرور آگاہ کر دینا کیونکہ وہ شخص جو خود سیاست میں تحریک استقلال میں اپنی جگہ تک نہیں بنا سکا تو جنرل جیلانی (فوج) کے سہارے جنرل ضیاء الحق کے کندھوں پر سوار ملکی سیاست میں راتوں رات داخل ہوا۔ صوبائی وزیر بنایا گیا پھر وزیر اعلیٰ اور آخر میں دو مرتبہ وزیر اعظم بنایا گیا جس آندھی سے وہ فوج کی مدد سے آیا تھا اسی طوفان سے فوج ہی کے ہاتھوں راتوں رات سیاست سے فارغ کر دیا گیا اب وہ حوالات میں بیکار بیٹھے

خود افواج پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ ہمارے شہدائے کارگل کا مذاق اڑا رہا ہے۔ پوری قوم اس کے اس بیہودہ انکشاف پر شرمندہ ہے کہ اس نے کس غدار وطن کو اپنا وزیراعظم بنایا۔ میں کہتا ہوں کہ طیارہ سازش کیس تو اس کے آگے ہیچ ہے۔ جب تک اس شخص پر کھلی عدالت میں غداری کا مقدمہ نہیں چلتا شہدائے کارگل کی قسم آنے والی نسل ہم کو معاف نہیں کرے گی اور نواز شریف کو غدار کارگل سے یاد کرے گی جس نے دو مرتبہ قرآن اٹھا کر یہ وعدہ کیا ہو کہ میں ملک کے خفیہ راز مرتے دم تک اپنے سینے میں رکھوں گا۔ صرف چند ماہ کی قید میں نہ صرف وہ راز افشا کر دیئے بلکہ اس میں بھارتی زبان اور جھوٹے دعوے بھی کر دیئے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کارگل میں کیا ہو رہا ہے وہ تو ایک فوجی کے بیٹے نے جو خود ان کی اپنی ہی پارٹی کا سینئر نائب صدر ہے کارگل میں ان کے ساتھ ساتھ تھا یعنی اعجاز الحق نے وہ جملہ بھی دہرا دیا جو اکثر لاہوری وزیراعظم جوش خطابت میں دہراتے رہے ہیں کہ ہم سری نگر میں پاکستان کا جھنڈا لہرائیں گے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ لوہار لوہار ہی ہوتا ہے بے شک اس پر سونے چاندی کا ملمع چڑھا دو اس کے اندر کا لوہا لوہا ہی رہے گا۔ جنرل صاحب اس واقعہ میں صرف سرکاری ترجمان کی بیان بازی سے یا فوج کا دفاع کرنے سے قوم کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ عملی طور پر غداری کا مقدمہ چلایئے قوم آپ کے ساتھ ہوگی۔ نواز شریف کی قسمت میں تو اسی دن سے زوال شروع ہو گیا تھا جس دن انہوں نے ایک بھرے مجمع میں بڑے تکبر سے کہا تھا جس کو ٹی وی پر بھی دکھایا گیا تھا کہ قوم نواز شریف کے ساتھ ہے نواز شریف کو اب کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ چند ہی ماہ بعد وہ نعرہ کہاں گم ہو گیا کہ قدم بڑھاؤ نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر آج جنرل صاحب نواز شریف کے ساتھیوں کو سلطانی گواہ بنانے کے لئے کہیں تو سب سے پہلے ان کے چہیتے آگے بڑھ کر سلطانی گواہ بننے کے لئے کود پڑیں گے۔ نواز شریف اور ان کے وزراء کی کرپشن کی داستانیں اگر لکھی جائیں تو اس کے لئے آکسفورڈ کی ڈکشنریوں سے بھی موٹی کتابیں بھر جائیں گی۔ اگر تمام کرپشن کے مقدمات چلائے جائیں تو دس سال بھی کم رہیں گے۔ ہر ایک چہیتے نے کرپشن (Corruption) کے محاذ پر حد کر رکھی تھی۔ صرف کسٹم کے ایس۔ آر۔ او (S.R.O.) اور آئی ٹی پی (I.T.P.) کے ردوبدل میں اربوں روپے ڈیوٹی کی مد میں کھا گئے۔ لاہور واہگہ سے بھارت جانے والی تمام بوگیاں حسین نواز کے لئے بک تھیں ریلوے کا ریکارڈ دیکھ لیں چینی اور مولیسس (Molases) ہندوستان برآمد میں دوسرے کارخانے دار چلاتے رہے ریلوے کا عملہ بے بس تھا۔ کیونکہ اوپر سے آرڈر تھا کہ

تمام بوگیاں نواز شریف اینڈ کمپنی کی شوگر ملز کے لئے بک تھیں کوئی اور بکنگ نہیں کروا سکتا تھا۔ وزیراعلیٰ لاہور کا صرف لاہور ڈیولپمنٹ اتھارٹی (L.D.A) کے ریکارڈ کی چھان بین کی جائے تو آدھا لاہور اور بدنام زمانہ کئی رائے ونڈ نکل آئیں گے۔ سیف الرحمان کے کارنامے تو ابھی سامنے آئے ہی نہیں ہیں۔ آصف زرداری کی سوئٹزرلینڈ کے اکاؤنٹ دریافت کرنے پر کروڑوں ڈالر خرچ کئے گئے اور بڑے بڑے دعوے کئے گئے جبکہ اصل میں تو ایک ڈالر بھی نہیں لا سکے اور تو اور خود سیف الرحمان کے برادر مجیب الرحمان نے جب کرکٹ کا کنٹرول سنبھالا تو بدنام زمانہ بنگلہ دیش میچ کے ہیرو پر مقدمہ ختم کر کے اس کو دوبارہ کپتان بنا کر لندن روانہ کر دیا۔ یعنی رشوت لیتا پکڑا جائے تو رشوت دے کر چھوٹ جائے۔ بندر کے ہاتھ استرا لگا ہوا تھا۔ کوئی محفوظ نہیں تھا حتیٰ کہ سپریم کورٹ تک کو نہیں بخشا گیا۔ عدلیہ کو آپس میں الجھا دیا گیا۔ قدرت نے دو موقع دیئے کاش کہ قوم کی خدمت کی ہوتی تو آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا۔ قدرت کا بھی اپنا انداز ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ اے آنکھوں والوں عبرت پکڑو۔

22nd June, 2000

یہ بجٹ کس کا ہے؟

اس سال بجٹ آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا ہے مگر ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ یہ بجٹ غریبوں کا ہے یا امیروں کا۔ دونوں حلقے ایک دوسرے پر الزام لگا رہے ہیں۔ مثلاً غریبوں کا کہنا ہے کہ اس بجٹ میں دولت ٹیکس ختم کر دیا ہے یعنی امیروں سے اب ان کی دولت پر ٹیکس نہیں لیا جائے گا یہ تو وزیر خزانہ نے بجٹ تقریر میں اعلان کر دیا۔ مگر جب یار دوستوں نے بجٹ وصولیابی دیکھی تو حیران رہ گئے کہ 9 ارب روپے پھر بھی دولت ٹیکس وصولی کے لئے دکھائے گئے ہیں۔ دو دن بعد جب اصل کہانی سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ 2000ء میں تو دولت ٹیکس وصول کیا جائے گا مگر جولائی 2001ء کے بعد سے دولت ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو اس بجٹ میں کیوں اعلان کیا گیا اگلے سال کے بجٹ میں اعلان کرنا چاہئے تھا۔ قوم سے عجیب تماشا ہوتا رہتا ہے۔ مگر جب ساری دنیا میں پیٹرول سستا ہو رہا تھا تو ہماری قوم کو سب سے مہنگا پیٹرول فروخت کیا جاتا تھا۔ جب ذرا سے دام بڑھے تو ہم نے فوراً مزید بڑھا دیئے۔ مگر جب دام گرے تو ہم نے دام گرانے کے بجائے پھر بھی دام بڑھاتے رہے۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ دام بڑھانے کا عمل ایک گھنٹے کے اندر ہو جاتا ہے اگر کوئی رعایت دی جاتی ہے تو ایک سال بعد اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس سال انکم ٹیکس کی شرح 5 فیصد تو کم کر دی مگر دولت ٹیکس کے بدلے انکم ٹیکس پر سرچارج آج سے ہی شروع کر دیا گیا۔ ڈیزل زیادہ تر غریب طبقہ استعمال میں لاتا ہے۔ مثلاً چھوٹی چھوٹی مشینریاں، بسیں اور ٹرک وغیرہ میں اس کا استعمال 80 فیصد ہوتا ہے اب یہ ٹرانسپورٹر غریب سواریوں سے زیادہ کرائے وصول کریں گے تو بھلا کیسے یہ غریبوں کا بجٹ ہوا۔ پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں انکم ٹیکس پھر انکم ٹیکس پر سرچارج اور پھر دولت ٹیکس پھر ٹرن اور (Turn Over) ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ممالک میں رہنے والے پاکستانی اپنی دولت

پاکستان میں نہیں رکھتے حالانکہ یہ بینک کا سود جس کو مسلمانوں کے مارک اپ کا نام رکھ دیا ہے۔ پاکستان میں 13 فیصد تک ہے جبکہ پوری دنیا میں 6 سے 7 فیصد تک ہوتا ہے۔ راتوں رات غیر ملکی کرنسی اکاؤنٹ منجمد کر کے ہم نے خود اپنے پاکستانی بھائیوں کی جمع پونجی لوٹ لی اور ہر سال 2 فیصد دولت ٹیکس بغیر کسی جواز کے ہم برسوں سے وصول کر رہے ہیں۔ اگر غیر ملکی اکاؤنٹ آج بھی بحال کر دیئے جائیں تو کم از کم اس حکومت کی ساکھ بحال ہو جاتی۔ دولت ٹیکس کو مزید ایک سال جاری رکھنے کا مطلب ہم نے دیار غیر میں رہنے والے پاکستانیوں کو ایک سال مزید اپنی دولت پاکستان لانے سے روک دیا ہے۔

میں نے پچھلے کالم میں تجویز دی تھی کہ اگر کالا دھن سفید کرنا ہے اور دیار غیر میں رکھنے والے ڈالروں کو پاکستان واپس لانا ہے تو فوری طور پر دولت ٹیکس ختم کر دیں۔ انکم ٹیکس کی شرح 15 فیصد کر دیں اور کالے دھن کو بغیر کسی کٹوتی کے یعنی 10 فیصد بھی نہیں لیں۔ کھربوں روپے کی آمد ہو جائے گی بشرطیکہ فارن کرنسی اکاؤنٹ بحال کر کے پہلے اپنی ساکھ بحال کریں۔ یہی روپیہ جب باہر سے آئے گا تو روپے کی ریل پیل سے ہماری معیشت کا پہیہ پھر سے چل جائے گا۔

ڈالر لانے والوں کو نئی انڈسٹریاں لگانے کے لئے ترغیبات دی جائیں۔ امریکہ جیسے امیر ملک میں اگر آپ صرف دس نئی نوکریاں دینے کا وعدہ کریں اور اس کے لئے انویسٹمنٹ (Investment) کر دیں تو وہاں کا پاسپورٹ یعنی شہریت مل جاتی ہے۔ ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک اور دیگر اداروں سے قرضوں کی تو بھیک مانگنے میں عار محسوس نہیں کرتے ان کی من مانی شرائط پر سود اور قرضے لیتے ہیں مگر اپنے ہی بھائیوں سے جب وہ ڈالر آفیشل (Official) بھیجیں تو 52 روپے ادا کرتے ہیں وہی ڈالر اگر ہنڈی کے ذریعے بھیجیں تو انہیں مارکیٹ میں 55 روپے ملتے ہیں۔ یہ تین روپے فی ڈالر حکومت کے کھاتے میں کیوں جاتے ہیں ہم قانونی ترسیل سے 55 روپے کا مارکیٹ ریٹ کیوں نہیں دیتے۔ ہم خود ایسے قوانین بناتے ہیں جس پر عمل کرنے سے نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ خوبصورت اعداد و شمار کے ذریعے ہم حقیقت اپنے عوام سے چھپاتے چلے آئے ہیں۔ اور آج بھی چھپا رہے ہیں۔ ذرا ایک جھلک بجٹ کے اعداد و شمار پر ڈالئے گزشتہ سال کا آمدنی ہدف 352 ارب رکھا گیا مگر ٹیکس میں 40 ارب روپیہ آمدنی میں سے کم آتا نظر آ رہا ہے۔ یعنی اس سال کا خسارہ 40 ارب روپے ہوگا۔ جبکہ اس سال کے بجٹ میں 420 ارب روپے کی ٹیکس وصولیابی دکھائی گئی ہے۔ یعنی جب ہم پچھلے

سال کے 352 ارب وصول نہیں کر سکے تو 70 ارب روپے نیا اور 40 ارب روپے پچھلے سال کا خسارہ کہاں سے وصول ہوگا یعنی ٹیکس کی مد میں 110 ارب روپے کا مزید خسارہ کس سے وصول کیا جائے گا۔ ایک طرف تو ہمارے ہر دل عزیز وزیر خزانہ کہتے رہے کہ یہ بجٹ عوامی ترجمانی کرے گا، نیا ٹیکس نہیں لگے گا۔ تاجروں کو ریلیف ملے گا وغیرہ وغیرہ۔ مگر بجٹ وہی روایتی قسم کا ہے۔ اخراجات کم کرنے کے بجائے 110 ارب روپے کا وصولیابی کا ہدف کہاں سے پورا کیا جائے گا۔ غریب عوام کو کیا ریلیف دیا گیا۔ غربت مکاؤ کے لئے 21 ارب روپے رکھا گیا یعنی 15 کروڑ عوام کے لئے جس میں 90 فیصد عوام دیہاتوں میں رہتے ہیں یعنی 150 روپے فی کس فی سال رکھا گیا ہے بھلا 150 روپے سے غربت کے خاتمہ کے دعوی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ایمنیسٹی اسکیم میں بھی کوئی خاص کامیابی نظر نہیں آ رہی ہے اب تک صرف 2 ارب روپے وصول ہو سکے ہیں۔ جبکہ ٹیکس سروے میں ہڑتالوں کی وجہ سے کم از کم 60 ارب کا نقصان ہو چکا ہے اور مسئلہ ابھی تک جوں کا توں ہے۔ سروے ٹیم میں فوج کو ملوث نہیں کرنا چاہئے تھا اس سے ہماری افواج کا وقار مجروح ہو سکتا ہے۔ دنیا میں اب ڈنڈے کے زور سے نہ حکومت کی جا سکتی اور نہ ہی ٹیکس وصول کیا جا سکتا ہے۔ ٹیکس کلچر بے شک ضروری ہے مگر عوام کی فلاح و بہبود کے لے صرف 21 ارب روپے اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔ ان کی خون پسینے کی کمائی اگر انہی شاہ خرچیوں پر خرچ ہوگی تو یاد رکھئے کوئی ٹیکس کلچر نہیں پیدا ہوگا اس کے لئے غیر ضروری اخراجات ختم کرنے ہوں گے۔ عوام کو بنیادی سہولتیں پہلے دینی ہوں گی۔ صرف ایک ہزار افراد کی چھانٹی سے کیا ہمارا نظام صحیح ہو سکے گا۔ جن افراد کو فارغ کیا گیا ہے ان میں تو وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے تمام زندگی کوئی رشوت نہیں لی اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ بھی شامل ہیں جو پہلے ہی سے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔

ان لوگوں کو نکالنے کا کیا معیار رکھا گیا تھا۔ اسی طرح کی چھانٹی نواز شریف کے دور میں بھی ہوئی تھی جس میں ایک مشہور کلکٹر کا نام بھی شامل تھا جن کو ایک سال قبل قتل کر دیا گیا تھا۔ ایسی چھانٹیوں کو مشکوک بنانے کے لئے بیوروکریسی چند ایک غلط نام شامل کر دیتے ہیں۔ ایوب خاں اور یحیی خان کے دور میں بھی ایسے اشخاص شامل تھے۔ یا تو وہ پہلے سے ریٹائرڈ تھے یا ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ پہلے زمانے میں گنتی کے افسران رشوت ستانی میں ملوث ہوتے تھے اور اب گنتی کے افراد رہ گئے ہیں جو رشوت نہیں لیتے وہ جب ان ایماندار افسروں کا نام لکھیں گے تو آئندہ وہ بھی ایمانداری سے توبہ کر لیں گے۔

30th June, 2000

ہمارے چھپے خزانے ہمارے منتظر ہیں

حکومت پاکستان آج کل چھپے ہوئے اثاثوں کی تلاش میں ہے اور اب تک 30 ارب روپے کے اثاثے وہ دریافت کرنے میں کامیاب بھی ہو چکی ہے۔ مگر اربوں روپے کمانے والے ہمارے شمالی علاقہ جات جن کو پاکستان کا سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں وہ دلفریب و پرفضا مقامات آج بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ آج کی دنیا میں ٹورازم کا بڑا کردار ہے جس کو ہم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ آیئے آج میں ایک ایسے فرانسیسی جوڑے کا آنکھوں دیکھا حال سنانے جا رہا ہوں جو اس نے پاکستان کے دورے سے واپسی پر مجھے سنایا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر یورپ جاتا رہتا ہوں ایک میرے فرانسیسی دوست اکثر مجھ سے پاکستان دیکھنے کی فرمائش کرتے رہتے تھے میں انہیں ٹالتا رہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ فرانس دنیا کا نمبر 1 ملک ہے جہاں سب سے زیادہ غیر ملکی سیاح آتے ہیں۔ جہاں دنیا کے سب سے خوبصورت سمندری ساحل ہیں اور سرد موسم میں بھی ایسے علاقے ہیں جہاں یورپ میں تو برف پڑ رہی ہوتی ہے اور ساؤتھ فرانس میں اسی طرح سورج نکل رہا ہوتا ہے تو پورا یورپ سردی میں ساؤتھ کی طرف ٹوٹ پڑتا ہے اور گرمیوں میں سرد ساحلوں پر فرانس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی ایک سے ایک شاندار ساحل سمندر، اصلی اور مصنوعی جھیلیں، تفریحی پارک، بہترین ہوٹل، ریستوران، سمندری بوٹیں، جہاز تقریباً ہر شہر میں موجود ہیں اس لئے میں اس فرانسیسی دوست کو ٹالتا رہتا تھا مجھے پاکستان اور فرانس کا فرق معلوم تھا کہ وہ جب پاکستان تفریح کے لئے آئے گا تو مایوس ہی ہو کر جائے گا کیونکہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ جیسے صاف ستھرے پہاڑی اور تفریحی مقامات سے بھلا پاکستان کیا مقابلہ کرے گا۔ مگر اس سال مجھے وہ بتائے بغیر دونوں میاں بیوی کرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی پہنچ گئے اور مجھ سے کہا ان کو بتایا جائے کہ پاکستان میں کون کون سے تفریحی مقامات ہیں اب تو مرتا کیا نہ کرتا میں نے ان کو پاکستان کے

شمالی علاقہ جات جو میں نے دیکھ رکھے تھے ایک ایک کر کے بتا دیئے کہ سوات میں مینگورہ، دم، بحرین، کالام، گلیشیئر، مالم جبہ، ماہوڈنڈ، چترال، شنگریلا، اسکردو، گرم چشمہ، جھیل سیف الملوک، کاغان، کے۔ٹو کا پہاڑی سلسلہ، بھوربن، ایبٹ آباد، ٹھنڈیانی، ایوبیہ، نتھیاگلی، اسلام آباد وغیرہ وغیرہ جو مجھے یاد تھے نقشوں کی مدد سے انہیں سمجھا کر روانہ کر دیا۔ دل میں کہا کہ جب وہ واپس جا رہے ہوں گے تو معذرت بھی کر لوں گا کہ کیوں کہ ان دوستوں کو میں پاکستان نہیں بلانا چاہتا تھا کیونکہ بیرونی دنیا میں بھارت نے ہم کو دہشت گردی کا الزام اور پروپیگنڈے کے ذریعے بدنام کر رکھا ہے۔ پندرہ دن گزر گئے جب وہ نہیں لوٹے تو مجھے تشویش ہونا لازمی تھی کچھ شمالی علاقوں کے دوستوں کے پتے بھی میں نے انہیں دے دیئے تھے اپنا موبائل فون نمبر بھی اور تمام ضروری ٹیلی فون نمبرز دیئے تھے کہ اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو مجھ سے یا میرے دوستوں سے ضرور رابطہ کریں۔ مگر جب دو کے بجائے چار ہفتے گزر گئے تو میں نے اپنے دوستوں کو فون کر کے دریافت کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً ہر ایک نے بتایا کہ وہ ان سے مل کر آگے گئے ہیں۔ کچھ تسلی ہوئی۔ خیر سوا ماہ بعد وہ دونوں میاں بیوی کراچی واپس لوٹے تو بڑے ہشاش بشاش اور خوش دکھائی دیئے۔ میں سمجھا کہ مجھ سے روایتی خوش مزاجی سے کام لے رہے ہیں۔ مگر وہ زبردست شکر گزاری کا مظاہرہ کر رہے تھے ان کی زبانی سنیئے کہتے ہیں کہ جب ہم پاکستان روانہ ہو رہے تھے تو ان کے تمام دوست کہتے تھے کہ پاکستان میں دہشت گردی عام ہے وہاں بھلا فرانس سے کیا مقابلہ جو تم پاکستان جانا چاہتے ہو۔ مگر آج جب ہم پورا پاکستان گھوم کر صحیح سلامت واپس آ گئے ہیں یہ صرف اخبارات کا پروپیگنڈہ ہے جس کا ہماری حکومت کو توڑ کرنا چاہئے۔ اگرچہ انہیں کہیں کہیں ٹوٹی سڑکوں اور معمولی بسوں سے زحمت اٹھانا پڑی مگر وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا شمالی علاقہ جنت سے کم نہیں۔ اگرچہ فرانس صاف ستھرا ضرور ہے مگر وہاں کی فضائیں آلودگی سے بھری ہیں جبکہ پاکستان کے علاقے صاف وشفاف آب و ہوا سے بھرپور ہیں۔ یہاں آکسیجن ہی آکسیجن ہے۔ لوگ بہت ہمدرد اور مہمان نواز ہیں ہم کو کوئی دقت پیش نہیں آئی البتہ انگریزی زبان ضرور رکاوٹ تھی کیونکہ پس ماندہ علاقوں میں لوگ انگریزی زبان نہیں جانتے مگر پھر بھی مطلب سمجھ کر ہم کو راستہ بتا دیتے تھے اتنا سستا ملک ہے کہ ہم نے دو ہفتے کے اخراجات کا جو تخمینہ لگایا تھا وہ ڈیڑھ ماہ میں بھی خرچ نہیں ہوا کھانا، پینا اور ہوٹل بھی بہت سستے تھے۔ ہمارے بجٹ کا آدھے سے زیادہ پیسہ بچ گیا ہے اور اتنے علاقے ہم نے گھومے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اگر حکومت پاکستان صرف ان

علاقوں تک پہنچنے کے لئے سڑکیں اور ٹرانسپورٹ کا بندوبست کر دے۔ ساتھ ساتھ غیر ممالک میں ٹورازم کے پمفلٹ اور پبلسٹی کر دے تو لاکھوں سیاح آ سکتے ہیں مگر افسوس جب ہم فرانس سے چل رہے تھے تو پاکستان کے متعلق کوئی معلوماتی ویب سائٹ تک نہیں ہے۔ جبکہ ہر بھارتی سفارت خانے میں درجنوں پمفلٹ ہم کو دیئے گئے تھے اور دو سال قبل وہ بھارت کا بھی تفریحی دورہ کر چکے ہیں۔ اگر موازنہ کیا جائے تو پاکستان کے شمالی علاقہ جات ان کے پہاڑی علاقوں سے کہیں بہتر ہیں۔ صاف ستھرے اور انتہائی سستے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر صرف K2 کی پہاڑیوں کا سلسلہ فرانس میں ہوتا اور K2 کا پہاڑ فرانس میں ہوتا تو اربوں ڈالر ہم صرف اس پہاڑ سے کما لیتے۔ نہ جانے پاکستان کی حکومت اتنے بڑے پہاڑ کو نظر انداز کر رہی ہے جبکہ یورپ میں تو ٹیڑھے مینار کو دیکھنے لاکھوں سیاح پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا کا سب سے بلند ترین پہاڑ جو دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ بھی ہے۔ ہمارا سیاحت کا محکمہ کہاں سو رہا ہے۔ ہمارے سفارت خانے کیا صرف عیاشی اور تنخواہیں وصول کرنے کے لئے کھولے گئے ہیں۔ کیا ہم ان علاقوں کو سجا سجا کر دنیا میں پبلسٹی کر کے لاکھوں سیاحوں کے لئے تفریح کا سامان پیدا نہیں کر سکتے۔ اس چھپے ہوئے خزانوں کو کیوں کام میں نہیں لاتے جو ایک طرف سیاحوں کی جنت بنے گا دوسری طرف غیر ملکی کرنسیوں کی ریل پیل کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کی غربت اور جہالت ختم ہوگی۔ میری موجودہ حکومت سے درخواست ہے کہ فوری طور پر اس فرانسیسی جوڑے نے جو ہماری آنکھ کھولی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر ہنگامی بنیاد پر سڑکیں، ٹرانسپورٹ، اچھے اچھے ہوٹل اور ریسٹوران کھولے جائیں اور غیر ممالک میں اس کی تشہیر کر کے اس کو کیش کرایا جائے۔ اگر سیاح ہمارے ملک آنے لگے تو وہ واپس جا کر اسی فرانسیسی جوڑے کی طرح دیگر لوگوں کو پاکستان کی طرف راغب کریں گے۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو میری آنکھوں میں چمک اور خود اعتمادی کی لہر دوڑ رہی تھی اور مجھے قائداعظم کا وہ تاریخی جملہ یاد آ رہا تھا کہ پاکستان دنیا کی سرزمین پر جنت کا ٹکڑا جیسی کے اندر اور باہر خزانے دفن ہیں۔ ہم نے اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ مگر افسوس پچاس سال گزرنے کے باجود زمین میں دفن خزانے ہم نہیں نکال سکے اور نہ ہی زمین کے اوپر کی جنت سے فائدہ اٹھا سکے۔

07th July, 2000

پاکستان سے غیر ملکی ایئر لائنز کا انخلاء

پچھلے ہفتے میں نے حکومت کی توجہ پاکستان کی ٹورازم پالیسی کی طرف کروائی تھی اور اس بات کی بھی نشاندہی کی تھی کہ ہمارا پاکستان خوبصورتی میں دنیا کے کسی بھی ملک سے کم نہیں ہے۔ یہاں کے دریا، پہاڑ، سمندر، وادیاں، جھیلیں، عجائب گھر اور سب سے اہم اور ضروری بات یہ تھی کہ انتہائی سستی تفریح گاہیں صاف اور شفاف آب و ہوا کے ساتھ بھری پڑی ہیں۔ مگر ہمارا ٹورازم سیاحت، ذمہ دار افسران اور ہمارے سفارت کار اس کو پروموٹ (Promote) کیوں نہیں کرتے۔ اس کی مزید وجوہات اور اس میں بے جا رکاوٹیں ڈالنے والے اداروں میں سب سے آگے سول ایوی ایشن کا کردار ہے جو لوگوں نے مجھے خطوط اور فون پر تفصیلات بتائیں۔ مجھے سول ایوی ایشن کے متعلق بتایا گیا کہ آج سے تیس پینتیس سال قبل جب ڈالر صرف 5 روپے کا تھا تو دنیا کی تمام ایئر لائنز پاکستان ضرور آتی اور جاتی تھیں کیونکہ کراچی کا ایئر پورٹ مغرب اور مشرق کے درمیان سنگم کی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی اگر کسی نے جاپان، ہانگ کانگ، چین، کوریا، تھائی لینڈ سے یورپ جانا ہوتا تھا تو اس کو لازمی کراچی ایئر پورٹ پر ٹھہرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح یورپ سے مشرق جانے کے لئے بھی کراچی کا ایئر پورٹ لازمی اسٹاپ ہوتا تھا جہاں سے مسافر بھی ملتے تھے اور ساتھ ساتھ جہاز کی دوبارہ پیٹرول کی بھرائی ہوتی تھی۔

یاد رہے اس زمانے میں دبئی نیا نیا آزاد ہوا تھا اور وہاں معمولی سی آبادی تھی۔ وہ بھی زیادہ تر پاکستانی مزدور طبقہ رہتا تھا۔ اسی وجہ سے معمولی غیر ائیر کنڈیشنڈ ایئر پورٹ تھا جس پر صرف چھوٹے چھوٹے جہاز اتر سکتے تھے۔ ہماری سول ایوی ایشن کے لینڈنگ چارجز سب سے کم تھے اور پیٹرول بھی بہت سستا دستیاب تھا۔ ایئر پورٹ پر تمام قسم کے جہاز اتر سکتے تھے۔ پاکستانی بھی روزگار اور تفریح کے لئے یورپ، امریکہ، تھائی

لینڈ، جاپان، کوریا وغیرہ جاتے تھے۔ اس زمانے میں زیادہ تر ویزے ایئر پورٹ پر ہی مل جاتے تھے۔ پیشگی ویزہ صرف امریکہ کا لینا پڑتا تھا۔

پوری دنیا میں ہمارے لیبر، ڈاکٹر، انجینئر، فارماسسٹ کی ڈیمانڈ تھی، باہر جانے کے لئے صرف اسٹیٹ بینک سے اجازت اور ڈالر لینے پڑتے تھے۔ یکا یک ہمارے روپے پر زوال آنا شروع ہوا۔

پیٹرول کی دنیا بھر میں کمی (Shortage) ہوئی۔ مہنگائی نے پاکستان کا رخ کر لیا تو ہماری ایوی ایشن نے بھی دنیا کی دیکھا دیکھی لینڈنگ چارجز دن رات بڑھانے شروع کر دیئے۔ ادھر پیٹرول کے نرخ بھی بڑھتے گئے۔ مسافروں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ اخراجات بڑھتے گئے۔ ادھر دبئی کے ایئر پورٹ میں توسیع شروع ہوئی خود ہماری قومی ایئر لائنز کے افسران نے یو اے ای (UAE) کی قومی ایئر لائن الامارات کی داغ بیل ڈالی۔ اس سے قبل وہ سنگاپور ایئر لائن، ترکش ایئر لائن اور کئی چھوٹے چھوٹے ممالک کی ایئر لائنز بنوا چکی تھیں۔ کیونکہ پی آئی اے ان دنوں کامیاب ترین ایئر لائنوں میں شمار کی جاتی تھی اور وہ تاریخی جملہ ''باکمال لوگ لاجواب پرواز'' واقعی ہمارا طرہ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ پھر وہی ہوا ہماری قومی ایئر لائن کو بھی نظر لگ گئی۔ کرائے بڑھتے گئے اور سہولتیں گھٹتی گئیں اور پھر بوڑھی بوڑھی ایئر ہوسٹس اور پرانے پرانے جہاز پاکستانیوں کے مقدر میں رہ گئے۔ پھر اسٹیٹ بینک نے پیشگی اجازت لینے کا قانون ختم کر دیا۔ لوگوں نے دوسری ایئر لائنوں میں زیادہ سفر شروع کر دیا کیونکہ پہلے وہ اسٹیٹ بینک سے صرف پی آئی اے ہی سے سفر کرنے کے پابند تھے تو دوسری طرف دبئی ایک زبردست تجارتی منڈی بن کر ابھر رہا تھا۔ دن رات اس کے ایئر پورٹ کی توسیع ہوتی گئی اور الامارات دنیا کی ہم سے بھی بڑی ایئر لائن بن گئی۔ دبئی کے سول ایوی ایشن نے خود ہم سے مقابلہ (Competition) شروع کر دیا۔ جہاز کی لینڈنگ فیس ہم سے بھی کم آفر کر دی۔ تیل تو خود ان کے یہاں پیدا ہوتا تھا۔ لہٰذا قدرتی امر تھا کہ دام بھی کم رکھے۔ مسافروں کی تعداد ہم سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ سیاحوں، تاجروں اور مزدوروں کی ایک یلغار ''دبئی چلو'' شروع ہوگئی۔ پہلے صرف وہاں پی آئی اے کا جہاز اترتا تھا پھر آہستہ آہستہ دنیا کے تمام ملکوں کے جہاز اترنے لگے۔ پھر ایمریٹس ایئر لائن نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی۔ نئے نئے جہاز زیادہ سے زیادہ سہولتیں دبئی میں ایک دن مفت رہنے اور کرایوں میں زبردست کمی کر کے اپنی ساکھ اور دھاک بٹھا دی۔

ہمارے سول ایوی ایشن کے افسران اپنی من مانی میں لگے رہے۔اب ایک ایک کر کے بین الاقوامی جہاز کمپنیاں اپنے دفاتر دبئی منتقل کرتے گئے۔سب سے پہلے پین امریکن نے کراچی سے پرواز بند کی۔پھر برٹش ایئر لائنز، کے ایل ایم، ایس اے ایس، فلپائن، جاپان ایئر لائن، ایئر فرانس، اٹالین ایئر لائن پھر جرمن کی لفتھنسا نے بھی کراچی سے اپنی اپنی پروازیں ختم کر دیں۔یورپ کی صرف ایک ایئر لائن سوئس ایئر باقی رہ گئی ہے وہ بھی اپنی پروازیں کم کر رہی ہے اور وہ دن دور نہیں کہ ایک دن وہ بھی دیگر ایئر لائنوں کی طرح کراچی سے اپنی پروازیں ختم کر دے۔ترکش ایئر لائنز نے بھی کچھ عرصہ اپنی پروازیں بند کر دی تھیں۔ان تمام ایئر لائنوں کے دفاتر دبئی منتقل ہو چکے ہیں اور دبئی آج کا بین الاقوامی ایئر پورٹ جو انہوں نے صرف دو سال میں تعمیر کیا خوبصورت ترین، بہت وسیع اور انتہائی سستی ڈیوٹی فری شاپس پر مشتمل ہے۔جہاں دنیا کی ہر چیز سستی اور وافر مقدار میں دستیاب ہے۔وہ سیاحوں کی جنت سمجھا جاتا ہے اور ہر مسافر لازماً ڈیوٹی فری میں جانے کے لئے بیتاب رہتا ہے اتنا بڑا ایئر پورٹ بننے کے باوجود دبئی کی سول ایوی ایشن نے دبئی میں دوسرا دنیا کا سب سے بڑا ایئر پورٹ جبل علی میں تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو 2005ء تک مکمل ہوگا۔ان کا کہنا ہے کہ ہمارا یہ موجودہ ایئر پورٹ غیر ملکی جہازوں اور سیاحوں کی تعداد کے لحاظ سے چھوٹا پڑ جائے گا۔لہٰذا 2002ء سے نئے ایئر پورٹ کی تعمیر شروع کر دی جائے اور تین سال میں یہ نیا ایئر پورٹ دنیا کا سب سے بڑا ایئر پورٹ ہوگا۔ دبئی کی اپنی آبادی چند لاکھ پر مشتمل ہے۔

ادھر ہم ہیں کہ ہمارے ایئر پورٹ کراچی جس کی آبادی سوا کروڑ سے زیادہ ہے ایئر پورٹ بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ڈیوٹی فری شاپس پر اکا دکا مسافر صرف ٹہلتے نظر آتے ہیں۔مگر ہمارے سول ایوی ایشن کے ذمہ دار افسران اپنی پالیسی نرم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔پچاس سال میں صرف ایک نئی ایئر لائنز کیتھے پیسفک اگلے ماہ سے اپنی پروازیں شروع کرنے والی ہے۔غالباً ان کا سابقہ جب اصل سول ایوی ایشن والوں سے پڑے گا نہ جانے وہ ہمارے ملک کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

دوسری طرف پاکستان واپس آنے والے مسافروں پر جن میں اکثریت بے چارے محنت کش اپنی جمع پونجی لے کر ایئر پورٹ پر آتے ہیں تو دھرکتے دلوں سے کسٹم اور ایف آئی اے کے عملوں سے گزر کر جب باہر آتے ہیں تو یہی ٹیکسی والے ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔پہلے تو وہ کھلم کھلا تین سے پانچ گنا کرایہ طلب کرتے تھے

مگر جب سے فوج نے اقتدار سنبھالا ہے۔ایک فوجی ان کو پرچی کاٹ کر ٹیکسی کا نمبر ڈال کر دیتا ہے۔وہاں تو ڈرائیور خاموشی سے روانہ ہو جاتا ہے آگے چل کر کچھ فاصلے پر وہ دوسرے مسافر بٹھا لیتا ہے۔پہلا مسافر احتجاج کرتا ہے تو وہ کہتا ہے بھائی اگر میٹر سے چلنا ہے تو اس مسافر کو برداشت کرو۔کبھی کبھی تو رات کے وقت وہ اجنبی مسافر اندھیرے علاقے میں لے جا کر مسافروں کو بھی لوٹنے سے باز نہیں آتے۔کیونکہ ہماری پولیس ان سے ملی ہوتی ہے کوئی پرچہ نہیں کٹتا۔الٹا پولیس والا کہتا ہے کہ وہ سامان جو چوری یا چھینا گیا ہے اس کی ڈیوٹی کی رسید دکھاؤ۔بے چارہ مسافر ڈر کر بد عائیں دیتا ہوا خالی ہاتھ لٹ لٹا کر شرمندہ شرمندہ اپنے گھر لوٹتا ہے ایک اور مزیدار خوبصورت اضافہ ہماری سول ایوی ایشن نے کر رکھا ہے۔وہ یہ پہلے لوڈر حضرات صرف دس روپے فی پھیرا لیتے تھے اس کو بڑھا کر 15 روپے کر دیا گیا پھر یکا یک اس کو 100 روپے فی پھیرا کر دیا گیا کوئی ان سے 7 گنا اضافہ کا جواز پوچھنے کا مجاز نہیں ہے۔کم از کم موجودہ حکومت جہاں اتنی اصلاحات کرنے کا پروگرام بنا رہی ہے ان ایئر لائنز کی پروازوں کے بند ہونے کی وجوہات ختم کرنے پر فوری توجہ دے اور یہ بے چارے مسافروں کی لٹنے اور منہ مانگے پیسے دینے کی روایات کو ختم کرے۔اس میں علاقہ پولیس پوری طرح ملوث ہے اس کا سدباب ضروری ہے۔

21st July, 2000

سیاسی ٹوٹی فروٹی

ویسے تو قدرت نے ہر پھل کا اپنا مزہ اور خوشبو رکھی ہے۔ مثلاً آم کا مزہ الگ ہوتا ہے، لیچی، کیلا، امرود، اورنج، خربوزہ، تربوز سب کے مزے ایک دوسرے سے جدا اور خوشبو الگ الگ ہوتی ہے۔ مگر سائنس نے اس میں بھی کمال کر کے ایک نیا مزہ اور خوشبو ان تمام پھلوں کو ملا کر روشناس کرادی ہے جس میں کسی بھی ایک پھل کا رنگ خوشبو یا مزا باقی نہیں رہتا اور اس کا نام ٹوٹی فروٹی رکھ دیا ہے اگرچہ آج کل مسلم لیگ کا بھی اسی طرح عمل شروع ہو چکا ہے گو کہ وہ بہت ٹوٹی پھوٹی ہوتی جا رہی ہے مگر میں اس کو ٹوٹی فروٹی سے ہی تشبیہ دوں گا کیونکہ میاں اعجاز الحق کہتے ہیں جہاں مسلم لیگ اور پی پی پی ایک ہوگی وہاں اعجاز الحق نہیں ہوگا۔ جبکہ بیگم صاحبہ کلثوم نواز شریف کا کہنا ہے کہ اگر پی پی پی اور مسلم لیگ کی بیگمات ایک ہوگئیں تو وہ دو نہیں گیارہ ہو جائیں گے اور موجودہ حکومت نو دو گیارہ ہو جائے گی۔

میاں اظہر کہتے ہیں کہ مسلم لیگ میں نئے گھس بیٹھیے آ گئے ہیں ہم مسلم لیگ کو ہائی جیک نہیں ہونے دیں گے۔ چوہدری شجاعت کو بھی اسی قسم کی شکایت ہے کیونکہ ان کے والد محترم ایک آنہ والے مسلم لیگ کے ٹکٹ کے وارث تھے یہاں میں وضاحت کرتا چلوں، مسلم لیگ کا ممبر بننے کے لئے اس کا فارم بھر کر ہی وہ مسلم لیگی ہوتا تھا اور جب سب سے پرانا مسلم لیگی ہوتا تھا وہ فخر سے کہتا تھا کہ میاں تم تو آج آئے ہو، مسلم لیگ میں، میں ایک آنے والا پرانا اور اصلی مسلم لیگی ہوں جس کے قائداعظم صدر تھے۔ اگر دیکھا جائے اور حلف اٹھوایا جائے تو میرے خیال میں آج جتنے بھی مسلم لیگی ہیں نہ تو انہوں نے فارم بھرا ہوگا نہ ہی ایک آنہ جمع کرایا ہوگا بلکہ شاید انہیں ہی نہیں، خود مسلم لیگ کو ممبر شپ کی فیس معلوم نہیں ہے۔ اگر ہے تو بتایا جائے کہ ممبر شپ فیس کیا ہے اور اب تک اس کی رقم کتنی جمع ہو چکی ہے کیونکہ پاکستان کو بنے اب 52 سال ہو چکے ہیں۔ ایک آنے سے

جو خود اب بند ہو کر پیسوں اور روپوں میں تبدیل ہو چکا ہے تو ممبر شپ فیس کیا ہے اور کونسی مسلم لیگ اصلی ہے جب ہم چھوٹے چھوٹے تھے تو قائداعظم کی مسلم لیگ ہوتی تھی۔ ذرا آنکھیں کھولیں تو کونسل مسلم لیگ پھر چند سال بڑے ہوئے تو کنونشن مسلم لیگ اور بڑے ہوئے تو قیوم مسلم لیگ، پھر جونیجو مسلم لیگ، پھر زیادہ بڑے ہوئے تو نواز مسلم لیگ پھر اس میں سے چٹھہ مسلم لیگ، وٹو مسلم لیگ (جناح لیگ) غرض جس کے ہاتھ چھوٹی موٹی حکومت لگی، اس نے مسلم لیگ کا لوگو (Logo) لگا کر لوگوں کو اصلی تے وڈی مسلم لیگ ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر آج مسلم لیگ کے تمام دھڑے بن گئے یعنی چوہدری لیگ، حق لیگ، اظہر لیگ، رشید لیگ وغیرہ وغیرہ بن گئی تو اے (A) سے لے کر زیڈ (Z) تک 26 الفاظ بنتے ہیں تو 26 تک تو گروپنگ کو مسلم لیگ اے اور 26 والے کو مسلم لیگ زیڈ (ضیاء) ہو جائے گا۔ سوچنا تو ہم کو یہ ہے 27 والے گروپ کو ہم کیا نام دیں گے۔ اس کی آج سے سوچ شروع کرنی چاہئے کیونکہ محترمہ بیگم کلثوم نواز شریف کا کہنا ہے کہ میں نہ سوؤں گی اور نہ کسی کو سونے دوں گی۔ کسی سے ان کی کیا مراد ہے۔ آیا جنرل پرویز مشرف صاحب یا خود ان کی پارٹی کے مضبوط ترین مخالفین جو خود مسلم لیگی کہلواتے ہیں۔ جنہوں نے انہیں بہت مایوس کیا ہے کبھی وہ بے چاری گاڑی کرین میں بیٹھ کر پریس کانفرنس اور جلوس کی قیادت کرتی ہیں کبھی چھت پر چڑھ کر، کبھی دیوار کی اوٹ میں۔ الغرض جس طرح آج کل کمپیوٹر اور ایجادات کا دور ہے روز وہ نئی نئی ایجادات کر کے غالباً ماضی کے تمام سیاسی حربوں کو مات دیکر گینیز بک میں پہلی مسلم خاتون سیاست دان کا نام لکھوانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ بشرطیکہ حضرت ہیورو کریٹ میاں تاجر الرحمان شیخ دین محمد محترم این جی اوز اسی طرح اس معصوم فوجی حکومت کو ستاتے رہیں گے اور ہماری حکومت دائیں بائیں سے لے کر مشرق اور مغرب سے لوگوں کو حکومت میں شامل کرتی رہے گی۔ یہ سمجھ کر ہم نے ٹوٹی فروٹی حکومت بنالی ہے جس میں دائیں بازو اور بائیں بازو کے لوگ تو ہم نے سنے تھے۔ یہ مشرق اور مغرب والے لوگ کون ہیں۔ تو پتہ چلا شمال والوں سے مراد نئے نئے آنے والے اور مغرب سے مراد وہ جو غروب ہو چکے تھے یا جو غروب ہونے کے نزدیک ہیں سب کو شامل کر کے تین سال سے بھی پہلے ''عوامی'' حکومت بنا کر اندرون ملک اور بیرون ملک دباؤ کو ختم کر دیا جائے۔ دباؤ (Pressure) پر یاد آیا حکومت کے لئے ایک نئی خوشخبری بھی کل کے اخبار میں، میں نے پڑھی جو نواز شریف کے برادر شہباز شریف کی دوسری اہلیہ المعروف 'ہنی' بیگم نے اپنی بیوٹی پارلر کو بتائی کہ جب تک شہباز شریف

اپنے موبائل سے ان سے بات نہیں کر لیتے۔ تب تک وہ ناشتہ نہیں کرتے۔ انہوں نے خود اعتراف کیا کہ حکومت کو وہ کئی مرتبہ پیشکش کر چکی ہیں اگر حکومت جناب شہباز شریف کو آزاد کر دے تو وہ اسی دن اس ملک سے بغیر اپنے شوہر بیرون ملک پرواز کر جائیں گی اور پھر کبھی مڑ کر نہیں آئیں گی۔ ان کا شکوہ ہے کہ حکومت نے ابھی تک ان کو مثبت جواب سے نہیں نوازا وہ صبح شام اپنے جواب کی منتظر ہیں۔ آخر میں انہوں نے افسوس کا بھی اظہار کیا کہ میاں شریف صاحب کی فیملی ان سے بالکل خوش نہیں ہے مگر ان کو شہباز شریف سے سچی محبت ہے اور اسی وجہ سے صبح صبح ان کا فون آ جاتا ہے۔

آخر میں تجارتی خبروں سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ حکومت اور تاجروں میں سرد جنگ جاری ہے۔ تاجروں کا کہنا ہے کہ ہم ٹیکس تو دینے کے لئے تیار ہیں مگر یہ بیوروکریٹ روز روز نئے نئے پنگے کر کے ہم کو فوجی حکومت سے لڑا رہے ہیں۔ حکومت صرف ٹیکس کلچر کا نفاذ کرنا چاہتی ہے جو حقیقتاً صحیح اور ضروری ہے مگر طریقہ کار اور رقم یعنی کتنا ٹیکس ہونا چاہئے اس پر رسہ کشی ہو رہی ہے۔

میں نے پچھلے کالموں میں بھی لکھا تھا کہ تاجروں کے نمائندوں کو ٹیبل پر بیٹھا کر اس کو حل کر لیں۔ آج نہیں تو کل یہ کام کرنا پڑے گا۔ خواہ مخواہ ہڑتالیں، مظاہرے ہمارے حق میں نہیں جاتے۔ مرحلہ وار ٹیکس سروے کروائے جو پہلے ہی سے ٹیکس دائرے میں ہیں۔ ان کے سروے کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ جو آج تک ٹیکس نہیں دیتے آئے۔ ان پر بتدریج ٹیکس لگائیں۔ ان تاجروں سے پچھلا حساب نہ مانگیں اور آج سے ہی ٹیکس کے دائرے میں لیں۔ مشاورت سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کسی بھی تاجر نمائندے نے یہ نہیں کہا کہ ہم ٹیکس نہیں دینا چاہتے۔

حکومت براہ راست ان سے بات چیت کر کے ٹیکس فکس کر دے یہ ان کا جائز مطالبہ ہے۔ حکومت کے اعلیٰ نمائندوں کو اس پر توجہ دینی چاہئے۔

28th July, 2000

نو ماہ کے مسائل کو کون ہوا دے رہا ہے؟

موجودہ فوجی حکومت کو نہ جانے این جی اوز یا مشیران یا بیوروکریٹس کس کس سے الجھائیں گے۔ نواز شریف کا جانا تو یقیناً لازمی امر تھا کیونکہ کسی ایک کو تو جانا تھا۔ لہٰذا نواز حکومت چلی گئی۔ لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا یا پھر مسلم لیگ والوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ جنرل پرویز مشرف کی پہلی اور پر مغز تقریر کو عوام نے سن کر سکھ کا سانس لیا اور بے پناہ امیدیں وابستہ کر لیں اور یہ بھی سوچا کہ چلو سیاست دانوں سے تو نجات ملی۔ اب عوام کی حکمرانی ہوگی، انصاف ملے گا، غریبوں کو مہنگائی اور بیروزگاری سے نجات ملے گی۔ قوم کا ڈوبا ہوا اربوں روپے کا سرمایہ ملے گا تو پاکستان اور پاکستان کے عوام خوشحال ہو جائیں گے۔ پولیس راج ختم ہوگا۔ چوریوں اور ڈکیتیوں سے نجات ملے گی۔ بجلی، گیس اور پیٹرول کے نرخ کم ہو جائیں گے۔ وہ روپیہ جو حکومت کی عیاشیوں پر خرچ ہوتا تھا وہ اب غریب عوام پر خرچ ہوگا۔ بدعنوان بیوروکریسی ختم ہو جائے گی اور ایماندار افسران قوم کی خدمت کریں گے۔ اس کے لئے ہر محکمہ میں فوجی افسران تعینات کر دیئے گئے۔ ہر ضلع میں آرمی مانیٹرنگ سیل قائم کر دیئے گئے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب نے اپنے رفقاء اور غیر سیاسی ایماندار افراد پر مشتمل وزراء نامزد کر دیئے۔ اگرچہ ان میں چند ایک ایسے بھی تھے جو ماضی کی حکومتوں میں شامل رہے تھے۔ مگر ان کا کردار بے داغ تھا۔ جب ہم اس گذشتہ نو ماہ کے تجزیہ کا ماحصل دیکھتے ہیں تو تمام باتیں جوں کی توں ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے اسمگلنگ کے خلاف چلائی جانے والی تحریک اور باڑہ مارکیٹوں کا خاتمہ آج بھی اسی زور و شور سے جاری ہے۔ لگتا تو بظاہر یہ ہے کہ موجودہ حکومت کو غلط سلط محاذوں پر الجھا کر کوئی ''غیبی'' طاقت اس حکومت کو بدنام کرنا چاہتی ہے کیونکہ پڑھے لکھے عوام کا تاثر یہی ہے اگر یہ حکومت کچھ نہ کر سکی تو آئندہ پاکستان اور پاکستان کی معیشت کا اللہ ہی حافظ ہے۔ جس غلط اور بھونڈے انداز سے چند پے در پے اقدامات کئے

گئے۔مثلاً جی ایس ٹی (GST) اور ٹیکس سروے دو الگ الگ اقدام تھے مگر اوپر تلے شروع کر دیئے۔تاجروں کو جی ایس ٹی کے معاملے میں صرف ڈاکومنٹیشن (Documentation) کے الجھے ہوئے نکات اور رقم پر اعتراض تھا جو بتدریج ہوتا تھا۔مگر بیوروکریسی نے اس کو انا کا مسئلہ بنالیا۔جس سے آج تک ہڑتالوں کا سلسلہ جاری ہے۔حکومت اور تاجروں کی یہ جنگ کہاں تک پہنچتی ہے۔اس سے کتنے ارب کا نقصان ہو چکا ہے اور کتنے ارب کا اور نقصان ہوسکتا ہے کسی کو اس کی پرواہ نہیں ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس حکومت کو ناکام بنانے میں یہ کسی ''غیبی'' مشورہ کا دخل نظر آتا ہے ایک طرف چیف ایگزیکٹو کو تاجروں کے نمائندوں سے ملنے نہیں دیئے جانے کا مشورہ دیا جارہا ہے تو دوسری طرف ہڑتالوں کا سلسلہ طول پکڑے جارہا ہے اسی طرح ٹیکس سروے میں ٹیکس دینے والے اور نہ ٹیکس دینے والوں دونوں کو برابر لا کھڑا کیا ہے۔دروغ برگردن راوی یہاں تک سننے میں آرہا ہے کہ خود انکم ٹیکس کے اہلکار یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ اگر تم نے ایک مرتبہ یہ فارم بھر دیا تو تمہاری اگلی پچھلی کسر پوری کرلی جائے گی۔فوجی حکومت آج ہے کل نہیں۔مگر ایک مرتبہ تمہارا رجسٹریشن ہوگیا تو آنے والی نسل بھی ٹیکس کے جال سے نہیں نکل سکے گی۔میں نے پہلے بھی تجویز دی تھی کہ اس کا مرحلہ وار سروے کیا جائے جو ٹیکس نمبر دیدے اس سے کچھ نہ پوچھا جائے کیونکہ اس کا سارا ریکارڈ ویسے بھی انکم ٹیکس کے دفاتر میں موجود ہے۔لہٰذا صرف اور صرف ٹیکس نہ دینے والوں کو گرفت میں لینے کی ضرورت ہے۔یہی بات بار بار تمام فیڈریشن چیمبر اور ایسوسی ایشن کے نمائندوں نے حکومت سے کہی تھی مگر اس میں بھی ہٹ دھرمی کروائی جارہی ہے کہ گدھے اور گھوڑے سب برابر ہوں گے ابھی یہ معاملے طے نہیں ہونے پائے تھے کہ بینکوں کے نادہندگان کی گرفتاریاں شروع کردی گئیں۔یہ ایک بہت اچھا عمل تھا۔مگر اس میں بھی بینک کا عملہ ملا ہوا تھا۔تنہا صنعت کار تو نہیں تھا۔بینک والوں نے بھی تو سود کی شرح تمام دنیا سے تین گناہ رکھی ہوئی تھی۔کئی صنعتیں بیٹھ گئیں خود ان کی رقم بھی ڈوبی تھی۔250 ارب کے بدلے 10 فیصد بھی نہیں ملا۔پھر ایمنسٹی اسکیم سے 30 ارب روپے ملا گویا تقریباً 60 ارب روپے جب ملا تو وہ رقم کہاں گئی۔کیا غریبوں میں بانٹا گیا۔آٹے، دال، گوشت، چینی یہ تو پاکستان کی پیداوار تھے۔ان کے دام کیوں بڑھے۔اس لئے کہ جب گیس، بجلی پیٹرول کے دام بڑھیں گے تو یقیناً اس کا اثر تمام اشیاء پر پڑنا لازم ہے۔ہر سہ ماہی بعد منی بجٹ آجاتا ہے۔جو ماضی کی حکومتوں کا وتیرہ تھا اور وہی تاریخی کلمات ادا کئے جاتے ہیں کہ اس سے عوام کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔گویا عوام

صرف ہوا اور پانی پر گزارہ کررہے ہیں۔پھر اچانک کالا باغ ڈیم کے مسئلے کو چھیڑ دیا گیا۔پتہ نہیں یہ کالا باغ ڈیم کس نے نام رکھا تھا ہم نے تو باغ کو ہمیشہ ہرا بھرا سنا اور دیکھا تھا مگر یہ کالا باغ ڈیم بھلا کوئی نام ہے۔اس سے تو واقعی ہر کوئی چڑے گا۔ایک باغ کالا ہو اور پھر اس پر ڈیم بنایا جائے۔جیسے ہی حکومت سندھ میں کوئی تبدیلی آتی ہے۔کالا باغ ڈیم کا شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔اتنے بڑے حساس معاملے کو اخبارات کی زینت بنا کر اچھالنا پھر سندھ کے عوام اور سرحد کے عوام کو لڑانے کی سازش نہیں تو اور کیا ہے۔تمام فریقین کو ایک ٹیبل پر بٹھائیں اور تینوں صوبوں کے انجینئرز صاحبان کو بٹھائیں اور جو خرمی اس ڈیم میں ہے اس کو دور کر کے ڈیم کا نام تبدیل کر کے پاکستان ڈیم بنا دیا جائے۔نہ کسی کا پانی ختم ہو نہ کسی کو زیادہ پانی ملے۔متبادل ذرائع سے اس کو خوش اسلوبی سے نمٹا جائے۔کہیں یہ ہماری یکجہتی کو تباہ نہ کردے۔ہمارے دشمن تو یہی چاہتے ہیں۔

بقول شاعر ''واعظ کا تو منشا ہے میخواروں میں چل جائے'' آخر میں جب کچھ نہ بچا تو ہماری وزارت حج نے بھی اپنا فرض نبھانا ضروری سمجھا۔پہلے ہی عام عازمین حج سعودی عرب میں معلمین اور ان کے کارندوں اور دور دور مکانات سے پریشان تھے۔جس کی نشاندہی میں نے پہلے بھی کی تھی۔آج پھر دہرا رہا ہوں کہ جب یہ عازمین حج جدہ پہنچتے ہیں تو بلا مبالغہ بھیڑ، بکریوں کی طرح ان کا سواگت کیا جاتا ہے۔ہمارے ملک میں جب سکھ یاتری آتے ہیں تو ہمارے افسران بالا ان کا استقبال کرتے ہیں، ان کے کھانے، آنے جانے کا خصوصی انتظام ہوتا ہے۔ضیاء الحق کی حکومت میں تو ان کو انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا تھا مگر افسوس ہمارے محکمہ حج اور اوقاف بشمول ہماری قونصلیٹ کے کسی بھی ذمہ دار افسر کو توفیق نہیں ہوتی کہ حج جیسے فرائض کے موقع پر خود آکر ثواب دارین حاصل کریں کیونکہ حاجی کی خدمت حضور اقدس ﷺ نے بہت بڑی نیکی بتائی ہے۔ایران، انڈونیشیا، خلیجی ممالک کو تو چھوڑیئے یہ تو اپنے حاجیوں کی خدمت کرتے ہی ہیں۔سنگاپور، تھائی لینڈ، بھارت جیسے غیر مسلم ممالک کے افسران جدہ ایئرپورٹ پر خود موجود ہوتے ہیں۔ان کے معلمین بھی ان کی مدد کرتے ہیں، جبکہ پاکستانی معلمین کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں ہوتا۔پھر جب اسپانسر شپ سے (یعنی ڈالروں کے عوض) جانے والوں کا حکومت پاکستان کی زبردستی رہائشگاہوں کا بندوبست کرنا غیر اخلاقی اور غیر ضروری ہے سعودی حکومت کو جب اعتراض نہیں ہے تو آپ کو کیوں ہے اور کیا عام حاجی آپ سے خوش تھا جو آج اسپانسروں کے گلے پڑ رہے ہیں۔دراصل خود ہمارے پاکستانی افسران سے مل کر معلمین کمیشن کے لالچ میں یہ بلڈنگیں اور

پرانے پرانے دور دراز علاقہ میں مکانات میں ٹھہرا کر نہ صرف حاجیوں کو تکلیف کا سبب بنے میں یہ بھی ایک مافیا بن چکی ہے ایران، سری لنکا، سنگاپور، ترکی، انڈونیشیا، ملائیشیا، جبوتی والا کامیاب سسٹم نافذ کرنا چاہئے۔ وہاں سے صرف ٹریول ایجنٹس حضرات ہی حاجیوں کو لاتے اور لے جاتے ہیں۔ حکومت ان حاجیوں کی خدمات کے عوض ان سے زرضمانت رکھواتی ہے کہ اگر کسی حاجی کو شکایت ہو تو فی کس اس کی ضمانت ضبط ہو جاتی ہے اور اگر شکایات زیادہ ہوں تو اس ٹریول ایجنسی پر جرمانہ عائد کیا جاتا ہے لہٰذا حکومت سب سے پہلے تو اس رہائش کی پابندی کو ختم کرے اور آئندہ سال سے صرف اور صرف ٹریول ایجنسیوں کے ذریعے حاجیوں کو حج پر بھیجے۔ ان سے زرضمانت رکھے تاکہ وہ اچھا کھانا، رہائش، لانے اور لے جانے کا صحیح صحیح بندوبست کرے اور حاجیوں کو معلمین کے برے سلوک سے بھی بچائے۔ اگر اس نے ان حاجی صاحبان کو سہولتیں فراہم نہ کیں تو اس کے خلاف باضابطہ کارروائی کی جائے۔ خدارا یہ پچاس سالہ پرانا طریقہ ختم کر کے مشہور اور اچھی ساکھ کی ٹریول ایجنسیوں کو حاجیوں کو لانے اور حج کرانے کی اسکیم شروع کرنی چاہئے۔ جیسا دنیا میں ہوتا ہے۔ ٹور پروگرام اب پاکستان میں بھی شروع ہو چکے ہیں، اس نیک کام میں کیوں نہیں ہو سکتا۔

03rd August, 2000

مسلم لیگ کا فیوچر

مغل بادشاہ شاہ جہاں کو جب ان کے بیٹے عالمگیر نے فضول خرچیوں اور کمزور حکومتی اقدامات پر معزول کر کے شاہی قید خانے میں رکھا گیا تو داروغہ زندان نے معزول بادشاہ سے پوچھا کہ جیل میں آپ کیا کھانا پسند کریں گے اور آپ کے کیا مشاغل ہوں گے۔ شاہ جہاں نے کہا کہ مجھے کھانے میں چنے اور مشاغل کے لئے بچوں کو پڑھانا چاہتا ہوں۔ داروغہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے آ کر اورنگزیب عالمگیر کو بتایا تو عالمگیر نے کہا جیل میں بھی بادشاہی کی خو نہیں گئی یعنی اناجوں کا بادشاہ چنا ہوتا ہے جو سو طریقہ سے پکایا اور کھایا جا سکتا ہے اور پڑھانے سے مراد استاد کی حاکمیت سے ہے کیونکہ استاد ہمیشہ حکم دیتا ہے جو بادشاہوں کا وتیرہ ہے میرے خیال میں معزول وزیراعظم نواز شریف صاحب نے بھی جیل جا کر اپنے آپ کو مسلم لیگ کی صدارت سے ایک لمحہ بھی دور رہنے کے بجائے اپنی بادشاہت قائم رکھی اور کسی کو بھی اتنی طویل المیعاد سزا سننے کے بعد بھی قائم مقام صدر بنانا منظور نہیں کیا حالانکہ ان کی پارٹی میں اب درجنوں نائب صدر بن چکے ہیں اور اعجاز الحق تو سینئر نائب صدر بار بار یہ بیان دے چکے ہیں کہ وہ اس عہدہ کے صحیح حقدار ہیں اور سیاست میں بھی یہی ہوتا ہے جب صدر حاضر نہ ہو تو نائب صدر ہی صدارت کرتا ہے ویسے تو اور بھی امیدوار ہیں۔ راجہ ظفر الحق نے تو اس دس ماہ میں پارٹی کو متحد رکھ کر یہ ثابت بھی کر دیا کہ وہ نواز شریف صاحب کی غیر موجودگی میں غیر متنازعہ شخصیت بن کر ابھرے ہیں مگر جب نواز شریف صاحب نے جیل سے خط بھیجا اور پارٹی لائن بنائی تو اس میں ان چہیتوں کا ذکر اور خراج تحسین پیش کیا جن کی غلط اور خوشامدانہ پالیسیوں اور چاپلوسیوں کی وجہ سے آج ان کو یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ مگر راجہ ظفر الحق کے لئے ایک جملہ بھی لکھنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ یہ بات سب سے زیادہ جناب چوہدری شجاعت، میاں اظہر، شیخ رشید، عابدہ حسین، فخر امام اور دیگر موجود قائدین نے محسوس بھی کی اور غالباً اسی وجہ سے

راجہ ظفر الحق نے میٹنگ شروع کرتے ہی استعفیٰ بھی دے دیا تھا جس کو متفقہ طور پر نامنظور کر کے ان سے درخواست کی کہ وہی اجلاس کی صدارت کریں۔ مسلم لیگ کی صدارت کے لئے تو ایک درجن سے بھی زیادہ آپ کو امیدوار مل جائیں گے۔

بقول شاعر

سینکڑوں ہاتھ متفق نکلے
ایک سکہ اچھال کر دیکھا

اپنی غیر موجودگی میں قائم مقام صدارت نہ دینا تو خود پارٹی کے قائدین کی توہین ہی نہیں بلکہ غیر جمہوری روایت بھی ہے قائدین پر عدم اعتماد بھی۔ جو سربراہ خود اپنی پارٹی میں جمہوری عمل سے روگردانی کرے اس کو ملک میں جمہوریت کا گلا گھوٹنے کا الزام لگانا کچھ زیب نہیں دیتا۔ یہاں میں شہباز شریف صاحب کے اس مشورہ کا نہ صرف زبردست حامی ہوں بلکہ داد بھی دیتا ہوں کہ انہوں نے فوج سے محاذ آرائی اور کشیدگی کم کرنے کے لئے صحیح مشورہ دیا کہ نواز شریف پارٹی میں الیکشن کروا کر آئندہ آنے والے پانچ دس سال کے لئے شریف فیملی کو سیاست اور صدارت سے الگ کر کے نئے لوگوں کو آگے لائیں مگر نواز شریف صاحب تو دیگر سیاست دانوں کی طرح مسلم لیگ کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے اپنی بیگم کو جو سو فیصد خاتون خانہ داری میں مصروف تھیں۔ یکا یک میدان سیاست میں راتوں رات اتار دیا اور بیگم صاحبہ نے شاہد آفریدی کی طرح جناب چیف ایگزیکٹو پر چاروں طرف سے چوکے اور چھکے لگانے شروع کر دیئے۔ جس کو قوم نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ مگر وہی ہوا جو ہماری بیوروکریسی اور پولیس نے غیر ضروری اقدامات کر کے ان کی سیاسی سنچری بنوادی جو جلوس مسلم لیگ کا نکلنے والا تھا وہی جلوس انتظامیہ کا نکل گیا۔ جس بھونڈے انداز سے ان کو روکنے کے اقدامات کئے اس سے ایک طرف مردہ مسلم لیگی گھوڑے میں جان پڑ گئی اور دوسری طرف عالمی میڈیا نے خوب نمک مرچ لگا کر ہماری جمہوریت کا مذاق اڑایا۔ اگر بیگم صاحبہ کے جلوس کو نہ چھیڑا جاتا تو مسلم لیگیوں کو اپنی صحیح حیثیت کا اندازہ ہو جاتا جس طرح 12 اکتوبر کو خود میاں صاحب کے اپنے شہر لاہور میں ایک بندہ نہیں نکلا تھا تو اب کہاں سے وہ جانثار ورکر لاتے اور مجھے تو بیگم صاحبہ کا یہ بیان پڑھ کر ہنسی آئی کہ صرف میں اور میرے میاں ہی بہادر ہیں گویا باقی پارٹی کو کیا کہا جائے۔ اس سے زیادہ ہنسی کی بات یہ کہی کہ اب پارٹی کارکن قربانی دینے کے لئے تیار

ہو جائیں۔ گویا اقتدار کے مزے میاں صاحب کی فیملی اور ان کے چہیتے اڑائیں اور قربانی بیچارے کارکن دیں۔ میاں صاحب نے اپنے دونوں ادوار میں کارکنوں کو کیا دیا تھا جو وہ ان کے لئے باہر نکلتے اور پولیس کی لاٹھی کھاتے اب جب مصیبت آئی تو کارکن یاد آئے۔ یہ تو وہی بات ہوئی۔ دو دوست جنگل میں جا رہے تھے راستے میں ایک پوٹلی پڑی تھی۔ ایک دوست نے اس کو اٹھا لیا۔ دیکھا تو اس میں قیمتی اشیاء اور سونا تھا دوسرے دوست نے کہا کہ آؤ اس کو آدھا آدھا بانٹ لیتے ہیں۔ پہلے دوست نے کہا کہ پوٹلی میں نے اٹھائی ہے لہذا میں ہی حقدار ہوں۔ دوسرے نے کہا بتائی میں نے تھی لہذا میں اس میں آدھا شریک ہوں مگر پہلے دوست نے کہا کہ بٹوارہ ناممکن ہے۔ یہ میری ملکیت ہے، دوسرا دوست چپ ہو کر رہ گیا کیونکہ پہلا والا دوست زبردست تگڑا بھی تھا اور مطلبی بھی۔ خیر آگے بڑھے تو چند آدمیوں کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دیکھا تو اس پوٹلی کا مالک اور چند پولیس والے اس کی تلاش میں آ رہے تھے تو پہلے نے جو پولیس والوں کو دیکھا تو کہا یار ہم پھنس گئے۔ دوسرے نے جواب دیا یہ نہ کہو کہ ہم پھنس گئے بلکہ یہ کہو کہ میں پھنس گیا ہوں۔ لہذا بیگم صاحبہ کو یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ 12 اکتوبر کو میاں صاحب اینڈ کمپنی پھنسی تھی۔ مصیبت ان پر آئی تھی نہ کہ کارکنوں پر۔ لہذا اب اس مصیبت میں خود ہی قربانی دیں۔ یہ بے چارے کارکن اور پانی پینے والے مسلم لیگی قائدین جن کو کچھ نہیں ملا وہ کیوں قربانی دیں۔ آواز دیں ان دودھ پینے والے مسلم لیگی قائدین اور خوشامدیوں کو جنہوں نے بار بار اقتدار کے مزے لوٹے۔ مجھے تو بعض مسلم لیگیوں پر ترس آتا ہے۔ جنہوں نے ایام اقتدار میں صرف قربانیاں ہی دیں اور آج بھی وہ مسلم لیگ کو بچانے میں لگے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ مسلم لیگ سے واقعی مخلص تھے اور آج بھی ہیں۔ ان کا تعلق اتفاق سے کراچی سے ہے جب بیگم صاحبہ مقدمات کی پیروی کے لئے کراچی اتریں تو وہ دودھ پینے والے مسلم لیگی قائدین غائب تھے اور وہ جو دونوں ادوار میں اقتدار سے دور رکھے گئے۔ صرف بول بچن پر ان کو خوش رکھا گیا۔ وہی بیگم صاحبہ کو تسلی دے رہے تھے اور میاں صاحب کے لئے جیل میں کھانے پینے کے بندوبست میں لگے ہوئے تھے۔ اب بھی وقت ہے مسلم لیگ کو بحران سے نکالنے کے لئے اور میاں صاحبان کی مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے مخلص قائدین کو آگے لایا جائے کیونکہ مسلم لیگ میں سب کرپٹ نہیں ہیں۔ سیاست کی بساط میں ہمیشہ فتح کا خواب نہیں دیکھا جاتا۔ یہ شطرنج کی طرح بازی ہاری بھی جاتی ہے اور ہاری ہوئی بازی جیتی بھی جاتی ہے خود بقول میاں صاحبان کے ہم نے بہت غلطیاں کی تھیں۔ تو میرا مشورہ یہی

ہے کہ ان غلطیوں کو پھر کیوں دہرایا جا رہا ہے، ایک طرف یہ کہا جاتا ہے جو مسلم لیگی قائدین فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔ دوسری طرف راجہ ظفر الحق کا چیف ایگزیکٹو سے ملنے پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے۔

ایک طرف حکومت سے مذاکرات کی ہدایت دی جاتی ہے تو دوسری طرف اعجاز الحق، عابدہ حسین، فخر امام، میاں اظہر، خورشید قصوری، شیخ رشید، میاں وحید، چوہدری شجاعت پر کیچڑ اچھالی جاتی ہے۔ لوٹے لوٹے کے نعرے لگوائے جاتے ہیں۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو مسلم لیگ قائداعظم اور لیاقت علی خان کے بعد سے لوٹا ہی پارٹی رہی ہے، اگر اس کے دھڑے ہی گننے بیٹھ جائیں تو حقیقت سامنے آجائے گی جس کو کہیں پناہ نہ ملی اس کو مسلم لیگ میں نہ صرف پناہ ملی بلکہ راتوں رات عہدے بھی مل جاتے ہیں۔ ذرا اس مسلم لیگ میں اصلی مسلم لیگی کو تلاش کریں۔ شاید ہی کوئی نکلے جبکہ جناب نواز شریف خود تحریک استقلال سے تشریف لائے تھے۔

سچ عدالت سے سیاست تک بہت مصروف ہے
جھوٹ بولو جھوٹ میں اب بھی محبت ہے بہت

حکومت کے دس (10) ماہ کی کارکردگی

موجودہ فوجی حکومت کو آئے آج ٹھیک دس ماہ ہو گئے ہیں۔ ضیاء الحق صاحب کے گیارہ سالہ فوجی دور کے بعد دو دو ادوار جمہوری حکومتوں یعنی پہلا پی پی پی حکومت کا پھر مسلم لیگ کا پھر دوبارہ پی پی پی حکومت کا پھر دوسری بار نواز شریف مسلم لیگ کا دور آیا۔ ان چاروں ادوار میں ایک بات مشترک (Common) تھی وہ یہ کہ مہنگائی، رشوت، ڈکیتیاں، قومی خزانوں پر حکومتی عہدیداران کا ڈاکہ، اسلحہ، منشیات روزمرہ کا معمول تھا جس سے عام اور خاص دونوں ہی پریشان تھے بیزار تھے اور نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ عوام کی بددلی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بھاری ترین مینڈیٹ جو بقول میاں نواز شریف کے قائداعظم محمد علی جناح کے بعد صرف ان کو ملا تھا۔ وہ محض صرف ایک چوتھائی عوام کے ووٹوں پر مشتمل تھا جس میں 75 فیصد عوام کی ناراضگی اور عدم شمولیت اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ عوام کو بھاری اکثریت یعنی 75 فیصد عوام نے ان دونوں ہی جمہوری اور جمہوریت کے نعرہ بردار لیڈروں کو مسترد کرتے ہوئے الیکشن کا بائیکاٹ کر کے اپنے شعوری خدشات کا کھلم کھلا اظہار کر دیا تھا مگر افسوس نہ پی پی پی اور نہ ہی مسلم لیگ کے قائدین اس کو سمجھ سکے اور اس کو مینڈیٹ سمجھ کر عوام کو بھول کر قومی خزانے کو لوٹنے میں لگ گئے جو جس کے ہاتھ لگ رہا تھا باپ کا مال سمجھ کر دونوں ہاتھوں سے بھر رہا تھا۔ چاہے وہ جنگی جہازوں، آبدوزوں کی خریداری ہو۔ موٹروے ہو، ہری پیلی ٹیکسیاں ہوں چنگیوں کے نیلام سے لے کر کسٹم کے ایس آر او ہوں، ہر طرف لوٹ مار کا بازار لگایا تھا تو دوسری طرف گیس، بجلی، پیٹرول روزمرہ کی اشیاء آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی تھی۔ کوئی نئی فیکٹری لگنے کے بجائے اکثر پرانی فیکٹریاں بند ہو رہی تھیں۔ نام نہاد سرمایہ کاری کے پروپیگنڈہ عروج پر تھا۔ چند کھانوں کی فرنچائز (اجارہ داریوں) کے نام پر جو مہنگے اور خواص کے لئے نیا مزہ پیدا کرنے کے لئے وجود

میں لائے گئے تھے۔ بڑے ڈونگرے برسا کر اسے غیر ملکی سرمایہ کاری کا نام دے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آخری دنوں میں مسلم لیگ کی حکومت میں خودکشیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ عوام کی تکالیف انتہائی حدود کو چھو رہی تھیں۔ قوم کو کوئی ریلیف دینے کے لئے نہیں سوچ رہا تھا اور نام تھا آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کا کہ جناب یہ ادارے ہمارے معاملات طے کرتے ہیں اور ہم مجبور ہیں۔ ان اداروں سے لئے گئے کھربوں ڈالر کے قرضے کھا کھا کر ہمارے حکمران غریب عوام پر بیٹھ گئے تھے جس کی وجہ سے سالانہ بجٹ پھر سہ ماہی بجٹ، پھر ماہانہ منی بجٹ، اب تو ہفتہ وار بجٹ سے بھی بڑھ کر روزانہ بجٹ کا نزول ہو جاتا تھا۔ عوام کا چلا چلا کر گلہ بیٹھ چکا تھا۔ اب وہ خاموش تماشائی بنے حسرت سے کبھی اپنے آپ کو اور کبھی ان حکمرانوں کی فضول عیاشیوں کا تماشا دن رات دیکھ رہے تھے کہ یکا یک ایک شام 12 اکتوبر کو بغیر عوام کی جدوجہد کے ایک انقلاب برپا ہوا۔ قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح نئے خدا کی تلاش میں اس کو خدا کا تحفہ سمجھ کر ایک مرتبہ پھر اس انقلاب کے ناخدا کے ساتھ اپنی اپنی امیدیں دوبارہ لگا بیٹھی۔

جنرل مشرف صاحب کا عوام سے پہلا خطاب عوام کے دکھوں پر مرہم کا کام کر گیا۔ قوم نے شکرانے کے طور پر مکمل یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ عظیم مینڈیٹ کا مٹکہ زمین پر گرا اور ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس مٹکے سے کوئی بھی عوامی ریلا برآمد نہیں ہوا۔ خود لاہور شہر میں ایک بندہ بھی سڑک پر تو آنا دور کی بات ہے دروازے تک نہیں آیا۔ قوم نے سکون کا سانس لیا اور سمجھ لیا کہ ہمارے فوجی بھائی ہرگز ہرگز ان نام نہاد جمہوریت کے علمبرداروں کی طرح عوام کا روزمرہ استحصال نہیں کریں گے۔ نہ ہی آئی ایم ایف، ورلڈ بینک کی آڑ میں نئے نئے غیر ضروری ٹیکس لگائیں گے نہ وہ عوام کی دولت عیاشیوں، شاہ خرچیوں پر خرچ کریں گے۔ مگر افسوس کہ وہ خوشیاں یا وہ امیدیں جو اس نئی حکومت سے وابستہ کر لی تھیں ماضی کی طرح آہستہ آہستہ عوام کی طرف بڑھنے لگیں۔ پہلے پیٹرول کے ریٹ بڑھے۔ پھر بجلی، پھر گیس کے نئے ٹیکس لگانے شروع کر دیئے۔ ٹیلی فون جیسے محکمے جہاں ایک طرف دنیا میں اس وقت اتنا مقابلہ (Competition) ہے کہ یورپ امریکہ میں 10 فیصد تک آ گیا ہے۔ گزشتہ دنوں میں امریکہ گیا تو میرے ایک دوست نے ٹیلی کارڈ لا کر دیا۔ صرف دس ڈالر کا۔ اس نے کہا اس کارڈ سے آپ ایک گھنٹہ تیس منٹ پاکستان بات کر سکتے ہیں جبکہ ہمارے ٹیلی فون کے محکمے نے حال میں ہی زبردست رعایت کے نام سے اخبارات میں اشتہارات کی مہم چلائی تو امریکہ کے لئے 72 روپے فی

منٹ کا پیکج دیا جبکہ امریکہ سے اگر آپ پاکستان ملائیں تو 550 روپے کے کارڈ سے آپ 90 منٹ یعنی =/6 روپے فی منٹ کال کر سکتے ہیں۔ میرے لکھنے کا مقصد ہے کہ وہ کون دوست نما دشمن جو دوسرے ادوار کی طرح اس دور میں بھی اندر آ چکا ہے جس کو معلوم ہے کہ دنیا میں کمی کا رجحان اپنے عروج پر ہے ہم دس روپے کے بجائے پندرہ روپے فی کلو آٹا، بیس روپے فی کلو چینی، تیس بتیس روپے خریدنے پر کیوں مجبور ہو رہے ہیں۔ دنیا میں اس وقت ہوائی سفروں پر زبردست کمی ہو چکی ہے مگر ہماری قومی ایئر لائن نے 14 اگست سے 15 فیصد کرائے بڑھانے کا اعلان کیا ہے یعنی اگر آپ پشاور یا اسلام آباد جائیں تو اس سے نجی ایئر لائن کا کراچی، دبئی کا ٹکٹ سستا ہے ایک طرف نجی ایئر لائنز کو بین الاقوامی روٹس نہیں دیئے جاتے۔ دوسری طرف قومی ایئر لائنز کا یکطرفہ اضافہ کیا معنی رکھتا ہے سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ایک دن اخبارات میں سندھ حکومت کا بجٹ آیا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ حکومت سندھ نے پراپرٹی پر کرپشن روکنے کے رجحان کو ختم کرنے کے لئے 9% پراپرٹی ٹیکس کم کر کے آدھا کر دیا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ نو ماہ بعد کم از کم ایک خوشی تو ملی مگر جب گزٹ آیا تو معلوم ہوا جو پراپرٹی مرکزی حکومت نے 1000 گز مقرر کی تھی حکومت سندھ نے کم از کم =/4000 سے =/7000 روپے کر دی ہے اور اس کا اطلاق دیہی زمینوں پر بھی ہوگا۔ پورے کراچی کو جس کے اپنے ہر کونے میں دیہی علاقے میں شہر تصور کر کے اسلامی اصول کے تحت آقا اور غلام کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا۔ واہ واہ سندھ بیوروکریسی زندہ باد۔ ابھی اس سے نہیں سنبھلے تھے کہ ہماری بلدیہ کراچی نے چارجڈ پارکنگ کا نظام پورے کراچی میں شروع کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ سبحان اللہ پہلے بلدیہ کے ٹیکس کم تھے کہ گاڑی کھڑی کرنے کی بھی سزا مقرر کر دی۔

محترمہ بلدیہ صاحبہ کیا آپ نے ہمارے شہر کا سیوریج کا نظام ٹھیک کر دیا ہے؟ کیا آپ کو ٹوٹی ہوئی سڑکیں نظر نہیں آتیں؟ کیا اندرون شہر آپ کی سڑکوں کی لائٹیں جل رہی ہوتی ہیں؟ کیا آپ نے گھر گھر پانی پہنچا دیا ہے جو آپ باقاعدگی سے سالانہ کنزرویسی کا بل بھیجنے میں تو کبھی دیر نہیں کرتیں۔ مگر ہفتوں پانی نہ آئے تو آپ کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ کیا ٹینکر مافیا آپ کی سرپرستی میں وہ پانی جو کراچی والوں کو مفت ملنا چاہئے۔ 300 روپے سے لے کر 500 روپے فی ٹینکر نہیں بکواتیں۔

اسی سندھ حکومت نے ادویات کی فروخت کے لائسنس کی فیس 200 سے بڑھا کر 1000 روپے

کردی۔ کیا آپ نے سندھ حکومت کی وزارت صحت کے ملازمین کی تنخواہ میں بھی پانچ گنا اضافہ کر دیا ہے۔

محترم جنرل پرویز مشرف صاحب آج مجھے ادب سے کہنے دیجئے حکومت کو چلانے کے لئے صرف ایمانداری کافی نہیں ہوتی۔ ایمانداری کے ساتھ ساتھ سسٹم کی ضرورت سب سے اہم ہے بدقسمتی سے آپ کی بیوروکریسی کم وبیش وہی ہے جو غلط نظام (System) چلا چلا کر حکمرانوں کو رسوا کرتی رہی ہے اور خود مظلوم بن کر دیمک کی طرح ہمارے سسٹم سے لگی ہوئی ہے۔ کوئی حکومت آئے کوئی جائے۔ وہ آنے والے سے آہستہ آہستہ قریب آ کر اس کو ایسی گھیرتی ہے کہ حکمران تنہا ہو جاتا ہے اس کے دوست، اقارب، ہمدرد اور پھر آخر میں وہ عوام سے دور ہو کر سانپ کی طرح صرف بین پر ہی ناچتا ہے بیوروکریسی شاطر کی طرح سیاست کی شطرنج پر ہر داؤ اپنے لئے چلتی ہے اور آخر میں شاہ کو مات دلا کر ہی رہتی ہے وہ گگلی باؤلرز کی طرح نئی نئی بولنگ کی آڑ میں الجھا کر رکھتی ہے کیا آپ کے مشیر اور وزراء صاحبان اس بات کی اہلیت رکھتے ہیں کہ وہ پیادوں اور گھوڑوں سے آپ کو بیوروکریسی کی چالوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ بظاہر دس ماہ کا سبق یہی کہہ رہا ہے کہ بیوروکریسی آپ پر چھا چکی ہے۔ آپ کے مشیر اور رفقاء خود گھر جا چکے ہیں اور اب عوام بھی یہی کہنے لگے ہیں کہ نواز شریف دور ہو، بے نظیر دور ہو یا اب فوجی دور ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی بھی ہمیں ریلیف دینے نہیں آتا۔ اب ہم کدھر جائیں، کون ہمیں حضرت عمرؓ کی طرح روٹی، کپڑا اور مکان دے گا، کوئی تو ہماری سنے، خودکشیوں کی باتیں ایک دفعہ پھر شروع ہو چکی ہیں۔ اللہ خیر کرے۔

17th August, 2000

حجاج کرام کا سنگین مسئلہ

گزشتہ پانچ سال سے ہماری حکومت اور سعودی حکومت کے درمیان حاجی صاحبان کی رہائش فراہم کرنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں جن کے حل کے لئے فوری اور موثر اقدامات کی ضرورت ہے۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں حج کے دو الگ الگ نظام وضع کئے گئے ہیں۔ پہلا نظام ریگولر حج اسکیم کا ہے جس کے تحت ہر حاجی جس نے حج کرنا ہو وہ فارم بھرے اور قرعہ اندازی کے ذریعے فریضۂ حج ادا کرے۔ دوسرا طریقہ سیلف اسپانسر شپ کا ہے اس کے ذریعے عازمین حج خود اپنا زرمبادلہ بیرون ملک سے منگوائیں اور بغیر قرعہ اندازی حج کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے اس کو ریگولر اسکیم سے تقریباً دس ہزار روپے زیادہ ادا کرنا پڑتے ہیں۔ اس کے لئے رہائش کا بندوبست خود حاجی صاحبان کرتے ہیں۔ مگر اس سال حکومت سعودیہ نے ریگولر اسکیم اور سیلف اسپانسر شپ اسکیم دونوں کے لئے رہائش متعلقہ حکومتوں کے ذریعے کر دی ہے۔ البتہ 50 افراد کے مشترکہ گروپس اپنی اپنی رہائش کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ وہ اس اسکیم سے مستثنیٰ کر دیئے گئے ہیں۔

ہر سال حاجی صاحبان جن کو سرکاری رہائش ملتی رہی ہیں انہیں یہ شکایت تھی کہ تنگ جگہ میں زیادہ سے زیادہ حاجی ٹھہرائے جاتے تھے اور دور دور مقامات حتیٰ کہ پہاڑیوں پر بھی ہمارے حکام معلموں سے مل ملا کر بوسیدہ بلڈنگیں سستے داموں میں لے کر ان بوڑھے اور مضافاتی علاقے سے آئے ہوئے حاجیوں کو ٹھہرا دیتے تھے جس سے ان کو پنج وقتہ نمازوں کے لئے خانہ کعبہ آنے اور جانے میں زبردست تکالیف رہتی تھیں اور ہماری بلڈنگ مافیا دیار حرم جیسی جگہ کو بھی کمائی سے نہیں چھوڑتے، بجائے حجاج کرام کی خدمت کے اپنی اپنی جیبیں بھرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتے۔ علاوہ چند خدا ترس حکام کے جنہیں حجاج کی خدمت کا صلہ معلوم ہوتا ہے اس میں ہمارے سیکریٹری حج جناب زبیر احمد قدوائی کی خدمات قابل قدر ہیں۔ سعودی حکام کی ہمیشہ کوشش رہی

ہے کہ وہ حجاج کرام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرتے رہیں۔ یہ واقعی مناسک حج ایک وقت اور ایک مقام پر اتنے بڑے مجمع کو کنٹرول کرنا دنیا میں اس کی دوسری مثال نہیں دی جاسکتی ہے۔ اسی وجہ سے اس سال حکومت سعودیہ نے حاجی صاحبان کے ٹھہرانے کی جگہ بھی فی کس ایک میٹر بڑھادی ہے تاکہ حاجی صاحبان تنگ جگہ کی وجہ سے تکلیف میں نہ رہیں۔ مگر ہماری حکومت نے کرایہ میں 400 سعودی ریال اضافے کا مطالبہ کردیا ہے جو بلاجواز ہے۔ اگرچہ 1200 میٹر تک کا فاصلہ یعنی 1.2 کلومیٹر بھی فاصلہ کچھ کم نہیں ہوتا پھر بھی حرم شریف سے پانچ وقت آنے اور جانے سے حاجی صاحبان یقیناً تھک جاتے ہیں۔ وہ صرف حج ادا کرنے کا جذبہ ہے جو اتنی تکالیف کے باوجود حوصلہ بخشتا رہتا ہے ورنہ اس زبردست گرمی، لو اور تپتی سرزمین پر 25 لاکھ افراد کا اجتماع خود ایک انہونی مثال ہے جس کو دنیا کے مسلمانوں نے نہ صرف زندہ جاوید کردیا ہے بلکہ اس میں ہر سال اضافہ ہورہا ہے یہ جذبہ مسلمانوں کی یکجہتی کی ایک انمول مثال ہی اور مخالفین اسلام کے لئے ایک چیلنج بھی ہے اور ان کی تشویش کا باعث بھی ہے۔ اس رہائش کے سلسلے میں جیسا میں نے لکھا ہے کہ ریگولر اسکیم کے حجاج کو تکالیف اور شکایات رہی ہیں جبکہ اسی اسکیم کے تحت تقریباً 40 ہزار افراد تھے اور جب اس میں مزید 50 ہزار افراد اسپانسر شپ والے شامل ہوجائیں گے تو اتنی تعداد میں اچھی اور نزدیک رہائش گاہیں نہیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی ہمارے حکمران جو سعودی عرب میں حجاج کرام کو آج تک کوئی آرام فراہم نہیں کرسکے بھلا ان اسپانسر شپ والے متمول اور شہری علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو کیسے اچھی جگہ فراہم کرسکیں گے کیونکہ اسپانسر شپ سے جانے والے حجاج اچھی اور نزدیک رہائش گاہوں، ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھی اپنی اپنی فیملی کے ساتھ، یہ یقیناً ہماری بلڈنگ مافیا اور معلم صاحبان نے مل کر حکومت سعودیہ کو غلط مشورہ دے کر اپنے لئے نئی آسامیاں پیدا کی ہیں تاکہ جو حجاج کرام ان کی دسترس رہائش سے باہر تھے ان کو بھی اپنے نیٹ ورک میں لاکر رہائش کی فراہمی کے ذریعے کروڑوں ریال کمانے کا سنہری موقع حاصل کرنا چاہا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب وہ چالیس ہزار ریگولر اسکیم والے حجاج کی مناسب رہائش کا بندوبست نہیں کرسکے تو نوے ہزار یا ایک لاکھ پانچ ہزار حجاج کا کیسے بندوبست کرسکیں گے یہ ایک سازش ہے ہماری حکومت کو چاہئے کہ وہ سعودی حکام سے مذاکرات کرے۔ اس کو پچھلی تکالیف کے نتائج اور آنے والے خدشات سے آگاہ کرے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو تقریباً چالیس ہزار اسپانسر شپ والے افراد حج سے محروم ہوجائیں گے۔ اس سے ہمارے ملک کی بدنامی

الگ ہوگی اور ان حجاج کرام کی بددعائیں الگ حکومت کے حصہ میں آئیں گی میرے خیال میں تو کہیں یہ فوجی حکومت کو بدنام کرنے کی ایک کڑی نہ ہو اس سلسلے میں میری چند تجاویز درج ذیل ہیں:

نمبر 1۔ پہلے کی طرح اسپانسر شپ سے جانے والے حجاج کو اپنی ہی رہائشیں لینے کی اجازت دے دی جائے۔ بشرطیکہ وہ اپنی کنفرم ہوٹلوں کی بکنگ کا ثبوت فراہم کردیں۔

نمبر 2۔ حج فارم جمع کرانے کی تاریخ میں 30 ستمبر تک توسیع کی جائے۔

نمبر 3۔ 50 کے بجائے 25 افراد کا گروپ تشکیل کرکے ریگولر اسکیم کے حجاج کو بھی رہائش سے مستثنیٰ کیا جائے۔

نمبر 4۔ پاکستان سے خدام حجاج صرف حج ڈائریکٹریٹ کے عملہ سے بھیجا جائے جس کو خود سعودی زبان اور علاقے سے واقفیت ضروری ہے۔

نمبر 5۔ جدہ آمد پر ایئرپورٹ پر ہمارے حکام دیگر ممالک کی طرح استقبالیہ کیمپ لگائیں اور ان کے آرام اور روانگی میں پاکستانی اسکاؤٹس ان کی مدد کے لئے موجود رہیں۔

نمبر 6۔ حکومت پاکستان ایاٹا (IATA) سے منظور شدہ ٹریول ایجنٹ کو دیگر ممالک کی طرح گروپ کی شکل میں نج کاری کرکے حاجیوں کو لانے اور لے جانے کی سہولت فراہم کرے اور اس بات کی ضمانت دے کہ قیام وطعام، ٹرانسپورٹ و دیگر ٹور کی طرح آسان اور سہل بنائے۔

سعودی حکام جس طرح انڈونیشیا، ایران اور ترکی کے معلمین بناتے ہیں اس طرح پاکستانی معلمین بنا کر پاکستانی حجاج کے لئے بھی یہ آسانیاں پیدا کرکے سعودی معلمین کے بجائے پاکستانی معلمین بنائے کیونکہ سعودی معلمین اردو زبان سے ناواقف ہوتے ہیں اور پاکستانی حجاج عربی زبان سے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ پاکستانی معلمین کا تقرر کیا جائے۔

اسی طرح ٹرانسپورٹ کے لئے مزدلفہ اور منیٰ لانے لے جانے کے لئے پرانی اور ناکارہ بسیں بالخصوص رات کے وقت مکہ، مدینہ کے لئے ٹرانسپورٹ بند کیا جائے اور اس کی جگہ نئی اور ایئر کنڈیشنڈ بسوں کا انتظام کیا جائے۔

مناسک حج کا دورانیہ 40 دن سے کم کرکے 31 دن یا زیادہ سے زیادہ 30 دن تک کردیا جائے تاکہ

حجاج کرام کی واپسی جلد اور آسان ہو سکے۔

ایئرپورٹ سے لے کر معلمین کے دفاتر تک ان کی سہولتیں اور آرام دہ بسیں فراہم کی جائیں اور جا کر تمام پاکستانی حاجیوں کے معلموں سے مسلسل رابطہ رکھا جائے کیونکہ بہت سے معلمین پاکستانیوں سے ناروا سلوک کرتے ہیں ان معلمین کو بلیک لسٹ کرایا جائے۔

آخر میں، میں سعودی حکام کو سٹی ٹرمینل قائم کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جو حج ٹرمینل پر ہونے والی اذیت، کوفت اور وقت کا ضیاع ختم کرنے میں سنگ میل ثابت ہوگا۔ اب آخر میں سعودی حکومت سے التماس ہے کہ جس طرح انہوں نے سٹی ٹرمینل بنا کر حجاج کی تکالیف کم کی ہیں قربانی کا نظام بھی اصلاح طلب ہے کیونکہ جو حجاج خود قربانی کرنا چاہتے ہیں ان کو بڑی مشکلات کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس میں وہ واقعی ہلکان ہو جاتے ہیں۔ اس کے لئے بھی علاقوں میں جگہ جگہ قربانی ٹرمینل بنا دیئے جائیں تو ایک طرف فاصلہ ختم ہو جائے گا دوسری طرف زیادہ قربان گاہوں سے لوگ بھی مستفیض ہو سکیں گے ورنہ وہ بینکوں اور معلمین کی طرف سے قربانی کے وقت میں مشکوک نہیں رہیں گے کیونکہ قربانی بھی حج کا لازم حصہ ہے۔ شام تک اور کبھی کبھی تو دوسرے دن تک ان کی قربانی کی خبر نہیں ملتی۔ مجھے امید ہے کہ حکومت سعودیہ اور ہماری حکومت مل کر ان دونوں مسائل کو حل کر کے حجاج کرام کی دعائیں لیں گی۔

25th August, 2000

ہیومن رائٹ والوں سے ایک سوال

ہیومن رائٹ یعنی انسانی حقوق کی تنظیمیں پوری دنیا میں انسانوں کو بنیادی حقوق اور انصاف پہنچانے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس بین الاقوامی ادارے کے ممبران کرتا دھرتا افراد کے دفاتر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کا کام صرف یہ دیکھنا ہے کہ کہیں کسی انسان جس میں عورتیں، بچے، بوڑھے شامل ہیں ان کا کوئی استحصال تو نہیں کر رہا ہے۔ اس میں سیاستدان بھی شامل ہیں۔ ان کی یہ تنظیمیں یہ مشاہدات کرتی ہیں کہ کہیں بچوں کے ساتھ زبردستی جبری خدمت تو نہیں لی جا رہی ہے جسے آج کے زمانہ میں (Child Labour) کہی جاتی ہے، کہیں خواتین کی توہین یا ان کی نسوانیت سے فائدہ اٹھا کر ان کے حقوق پامال تو نہیں کئے جا رہے ہیں، کہیں ہمارے بوڑھے افراد تشدد کا شکار تو نہیں ہو رہے ہیں۔ ہمارے سیاستدانوں پر تو کوئی ظلم نہیں ہو رہا ہے یعنی بین الاقوامی قوانین کے مطابق تمام انسان بشمول عورتیں، بچے، سیاستدان، تاجر، افراد قانونی تقاضے پورے کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ برابر کا سلوک اور انصاف ہو رہا ہے۔ کوئی کسی کا استحصال، ظلم، تشدد یا غیر انسانی سلوک تو نہیں کر رہا ہے اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ بین الاقوامی تنظیمیں جن کا فرض صرف دنیا کے ہر انسان کو انصاف کے دائرے میں رہتے ہوں، بنیادی حقوق کا تحفظ مہیا کرانا ہے، بہت زور و شور سے تمام ملکوں میں ان کا نیٹ ورک کام کر رہا ہے جسے اقوام متحدہ اور تمام ترقی پذیر ممالک کی حمایت حاصل ہے ان کے نامزد افراد غیر ترقی یافتہ یا یوں کہیں پسماندہ ممالک میں اپنی سرگرمیوں کو فعال رکھتے ہیں اور دنیا کے عالمی ذرائع ابلاغ میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ یورپ امریکہ کے علاوہ باقی تمام افریقی، ایشیائی، گلف کے علاقوں میں نہ تو تعلیم ہے اور نہ ان کو بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ اس تنظیم کی یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ ان ممالک میں انسانی حقوق بشمول عورتوں، بچوں، سیاستدانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ مگر اس تنظیم نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس کا

ذمہ دار کون ہے پسماندہ ممالک ان ہی کی پروردہ تنظیمیں آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ایشین بینک وغیرہ وغیرہ اداروں سے اپنے اپنے ممالک کے لئے قرضے حاصل کرتی ہیں تاکہ ان کے عوام بھی خوشحالی کی طرف جائیں مگر اتنے قرضے لینے کے باوجود آج تک خوشحالی ان سے کوسوں دور ہے جبکہ ان تنظیموں کے (Financiers) نہ صرف خوشحال ہیں بلکہ پسماندہ ممالک کے حکمرانوں کو دھمکیاں دے رہے ہیں کہ وہ اپنے قرضے وقت پر ادا کریں۔ ورنہ ان کو نادہندہ قرار دے کر مزید مشکلات میں مبتلا کر دیں گے ان اداروں کو اب جان لینا چاہئے کہ ان کے قرضے سودوں کے درمیان اتنے دب گئے ہیں کہ اصل تو ادا ہو ہی چکا تھا مگر ان کے مکڑی نما جال میں اب اتنی مضبوطی نہیں ہے کہ غریب اور پسماندہ ممالک ایک یا زیادہ سے زیادہ دو سال تک ان کی قسطیں/سود ادا کر سکیں گے۔ میرے اوپر کی تمہید لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس نئے سائنسی دور میں کسی کو نہ تو زیادہ بیوقوف بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی جبر و تشدد کی حکمرانی ہو سکتی ہے۔ اگر انسانی حقوق کی بات کی جائے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں، یورپ میں جانے والے ایشیائی افراد کیا انسان نہیں ہیں۔ ان کے لئے ویزے کا حصول کیوں ضروری ہے وہ غربت زدہ علاقے سے بہتر حالات والے علاقے میں آنا چاہتے ہیں اور انہوں نے آ کر ان ہی مغربی علاقوں میں ان کی معیشت کو بہتر بنایا ہے وہ یورپ کے آرام پسند افراد کی نسبت 24 گھنٹے کام کر کے بے شک اپنے لئے آسودگی تو حاصل کی مگر دوسری طرف اس کا تمام فائدہ تو یورپ کو ملا کیونکہ ان کے باشندے اتنی محنت مشقت کے عادی نہ تھے یہ وہی ایشیائی باشندے ہیں جنہوں نے ان کی ایکسپورٹ کو بڑھایا مگر کیا دیا انہوں نے گذشتہ تیس سال سے اپنے ممالک میں ان ایشیائی باشندوں پر آنے اور جانے کے دروازے آہستہ آہستہ بند کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ یہی حال امریکہ کا بھی ہے ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ڈاکٹر، انجینئر، بی فارم، ٹیچرز بلوا کر ہمارے ملک میں ہی ان کی قلت کر دی تھی۔ امریکہ جانا ایک فیشن تھا مگر جب آج یہی ممالک ان میں خود کفیل ہو گئے تو ہم پھر تیسرے درجے کی مخلوق بن گئے۔ مگر کہاں ہیں وہ عالمی تنظیمیں جو خود کو انسانی حقوق کی علمبردار کہتی ہیں۔ آئیں اور دیکھیں بین الاقوامی ایئرپورٹ پر کس کس طرح ایشیائی، افریقی اور غریب خلیجی ریاستوں کے آنے والے مسافروں سے توہین آمیز سلوک کیوں ہوتا ہے آج تک ہیومن رائٹ کے افراد کبھی ان انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر آ کر دیکھتے ہیں کہ یورپی اور امریکن ایئرپورٹ پر کس طرح ہے ان غریبوں کی تضحیک ہوتی ہے وہ ہمارے ایشیائی بچوں کی جنگ ہمارے ہی ملک میں کیوں لڑنا

چاہتے ہیں۔ ہماری خواتین کی بے حرمتی کی آواز ہمارے ہی ملک میں آ کر اٹھاتے ہیں ان کو نہیں معلوم کہ ہمارے انہی بچوں، خواتین اور محنت کشوں کو خود ان کے ترقی یافتہ ممالک ویزے دینے میں کیسا کیسا سلوک کرتے ہیں۔ کبھی انہوں نے ان ممالک سے پوچھا کہ وہ ایسا تعصب کیوں کر رہے ہیں۔ کیونکہ بچے، عورتیں، محنت کش کیا وہ ان ممالک سے مختلف ہیں۔ اگر ہم اپنے ملک میں ظلم کریں تو آپ ہمارے خلاف آواز اٹھائیں اور جب آپ خود یہ ظلم کر رہے ہوں تو ہم کس سے انصاف طلب کریں۔ انسان انسان ہوتا ہے خواہ وہ یورپ کا ہو یا ایشیاء کا ہوا گر خوش قسمتی سے ایک پاکستانی بچہ امریکہ یا یورپ میں پیدا ہو گیا ہو تو اس کو اتنی سہولتیں کیوں۔ اگر اسی باپ کا دوسرا بچہ پاکستان میں پیدا ہو گیا تو قصور بچے کا ہے یا اس کے باپ کا۔ میں کہتا ہوں کہ جب آپ بین الاقوامی حقوق یعنی ہیومن رائٹ کی بات کرتے ہیں تو آپ کو جغرافیہ کو بھولنا ہوگا۔ پہلے فرانس میں پیدا ہونے والا بچہ جرمنی میں ویزہ لے کر جاتا تھا آج یورپ میں اس کو کوئی ویزے کی ضرورت نہیں ہے امریکہ اور برطانیہ میں پیدا ہونے والے بچے کو کسی ویزے کی ضرورت نہیں ہے کہاں گئے وہ ہیومن رائٹ کے علمبردار یعنی ہمارے بچوں کو ویزے لینے کے لئے قطاروں میں لگنا پڑے اور ایک گورے بچے کو بغیر قطار کے خود بخود ویزہ مل جائے، کیا یہی ہیومن رائٹ ہے وہ بھی اس نئی صدی کا جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے اے ہیومن رائٹ کے علمبردارو! آؤ اور آگے بڑھ کر ثابت کرو مشرق اور مغرب کا انسان شمال اور جنوب میں بسنے والا انسان اب ایک ہے، اس کو کسی ویزے، شناخت، علاقے یا نسبت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انسانیت کی ضرورت ہے جس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اگر اس تقسیم کو ختم نہیں کیا تو خود ہیومن رائٹ والے تقسیم ہو جائیں گے اور خود ساختہ یہ نظام آج نہیں تو کل ضرور ختم ہو جائے گا کیونکہ اللہ کی سرزمین صرف اللہ کی ہے اور سب کو اللہ کی ہی طرف لوٹ جانا ہے۔

08th September, 2000

ایک اور قائداعظم کی تلاش

تعلیمی میدان میں پوری دنیا میں الیکٹرونک انقلاب آچکا ہے، امریکہ میں تو گھر بیٹھے آپ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اب ضروری نہیں ہوگا کہ آپ تعلیمی درسگاہوں میں جا کر ہی تعلیم حاصل کریں بلکہ آپ دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہوں۔ وہیں سے اپنے کمپیوٹر سے رابطہ کریں اور داخلہ فیس، ماہانہ فیس اور جو بھی ان کے چارجز ہیں اپنے کریڈٹ کارڈ نمبر دے کر گھر بیٹھے پڑھائی کر سکتے ہیں۔ اس میں امریکن، برٹش، فرنچ، جرمن، جاپان حتیٰ کہ آپ اپنے ملک کے بھی تعلیمی نظام کے مطابق تعلیم حاصل کر کے گھر بیٹھے ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ تعلیمی میدان میں امریکہ نئے نئے طریقے ایجاد کرنے میں سب سے آگے ہے۔ اسی غرض سے میں نے اپنی نئی اکیڈمی کے لئے انٹرنیٹ پر امریکن درسگاہوں سے پاکستان کے لئے جدید تعلیمی سہولت کے لئے انکوائری کی۔ جلد ہی کئی درسگاہوں سے آفر (Offer) آ گئے کہ ہم یہ تعلیمی نظام پاکستان کو دینے کے لئے تیار ہیں۔ ایک درسگاہ جس نے یہ نظام تیار کیا ہے اس نے امریکہ آ کر ذاتی معائنہ کی بھی دعوت دی چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ امریکہ جا کر اس کو خود معائنہ کروں۔ لہٰذا امریکہ جا کر کئی تعلیمی اداروں اور درسگاہوں کا دورہ کیا اور اس نئے تعلیمی نظام میں جس میں نہ کتابیں، نہ کاغذ، پینسل درکار ہیں بلکہ صرف ایک آپ کا کمپیوٹر اور آپ کی اپنی انگلیاں ہی کافی ہیں نہ امتحان دینے کے لئے آپ کو اسناد کی ضرورت ہے نہ امتحانات کو جانچنے کے لئے کاپیوں کی ضرورت ہے، کمپیوٹر آپ کے دیئے ہوئے جوابات کو آٹومیٹک جانچ کر نمبر دے دے گا۔ امتحان کے جوابات کا رزلٹ خود بخود آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے فلاں پرچے میں کتنے غلط جوابات دیئے ہیں اور کتنے صحیح جوابات دیئے۔ تمام الگ الگ مضمونوں میں سرایک کا الگ الگ رزلٹ آتا جائے گا اور سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحانات کے رزلٹ نہ صرف اس درسگاہ کو معلوم ہو جائیں گے بلکہ آپ کو اور آپ کے والدین کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ کس مضمون میں پاس ہیں اور

کس مضمون میں فیل ہیں۔ پورے سال میں آپ نے کتنے دن اس کمپیوٹر پر پڑھا ہے یہی آپ کی حاضری سمجھی جائے گی اور کتنے گھنٹے اس کمپیوٹر پر صرف کئے ہیں وہ بھی ظاہر ہوگا اور کون کون سے مضامین آپ نے پڑھے ہیں۔ کس مضمون میں آپ کمزور ہیں سارا سلیبس اس کلاس کے مضامین کمپیوٹر میں موجود ہوتے ہیں جن کی مدد سے آپ اپنی تعلیم گھر بیٹھے مکمل کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی وقت، عمر کی قید نہیں ہے۔ اگر آپ رات کو فارغ ہیں تو آپ رات کو اپنا کمپیوٹر آن (On) کر کے پڑھائی کر سکتے ہیں۔ فارغ وقت میں آپ اپنا کاروبار یا سروس بھی ساتھ ساتھ کر سکتے ہیں۔ اس نئے تعلیمی نظام سے استادوں، پروفیسروں کے بے روزگار ہونے کا بھی خطرہ ہے اگر یہ نظام پوری طرح چھا گیا تو تعلیمی ادارے بھی بند ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے حکومت نئے نئے روزگار نئے کنونشن ہال، ٹریڈ سینٹر کھیلوں کے میدان تعمیر کروانے میں مصروف ہے اور ان پروفیسروں کو تعلیمی نظام کے کورس بنوانے پر لگا رہی ہے تاکہ ان کی افادیت کم نہ ہو اور ان کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ اس تعلیمی نظام کا کچھ حصہ تو مکمل ہو چکا ہے اور کچھ ابھی تکمیل کے مراحل میں ہے اس کو عام کرنے کے لئے چھوٹے بڑے شہروں غیر ممالک میں دوسرے کاروباری اداروں کی طرح رائلٹی (Franchise) دے کر عام شہریوں تک پہنچایا جائے گا۔ اس پر اربوں ڈالر صرف ہو چکے ہیں۔ اس کو بڑے بڑے ادارے خرید کر بھی عام طالب علم تک ایڈمیشن فیس، ماہانہ فیس لے کر پہنچائیں گے کیونکہ اس کی رائلٹی بہت مہنگی ہے چھوٹے موٹے ادارے اس کو نہیں خرید سکیں گے اور تعلیمی فیس بھی شروع شروع میں بہت زیادہ ہے مگر جب اس نظام میں زیادہ ادارے آئیں گے اور نئی ایجادات لائیں گے تو یقیناً اس میں بھی دوسرے کاروباری طریقوں کی طرح کمپیٹیشن شروع ہو جائے گا اور یہ بھی عام طالب علم کی دسترس تک پہنچ جائے گا۔ مگر ہم جیسے غریب اور پسماندہ ممالک میں اتنی مہنگی تعلیم اور ہر طالب علم کے پاس کمپیوٹر کہاں سے آئے گا۔ ہماری حکومت نے تو تعلیمی کمپیوٹر پر بھی امپورٹ ڈیوٹی لگا رکھی ہے۔ اسی وجہ سے جو تعلیمی نظام اور جدید کمپیوٹر سسٹم کے بجائے ہم فرسودہ اور پرانے نظام کے کمپیوٹر درآمد کر رہے ہیں۔ ہمارا پڑوسی ملک بھارت دنیا میں دوسرے نمبر پر آ چکا ہے اور ہم پچاسویں نمبر پر بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہونہار طالب علم کمپیوٹر میں بھارت سے زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ ہماری حکومت اقراء سرچارج تو وصول کر سکتی ہے مگر جدید تعلیمی درسگاہیں نہ تو بنا رہی ہے اور نہ ہی اس میں کسی کی مدد کرتی ہے گزشتہ بیس سال میں پورے ملک میں بیس بھی کالج یونیورسٹیاں نہیں بنیں جو معیار بیس سال پہلے ہمارے سرکاری کالجوں، یونیورسٹیوں کا تھا وہ اب چند ایک کے علاوہ

ختم ہو چکا ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قومیانے (Nationalization) کی وجہ سے ہم تعلیمی میدان میں بہت پیچھے جا رہے ہیں۔ کسی مفکر کا قول ہے اگر آپ کسی قوم کی ترقی دیکھنا چاہیں تو اس کے تعلیمی معیار کو جانچنے سے ہی پتہ چل جائے گا کہ ہم کتنی ترقی کر سکتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں منشیات، اسلحہ، خرافات عام ہو چکی ہیں۔ امتحان میں نقل ایک فیشن بن چکا ہے۔ اساتذہ بھی رشوت لینے لگے ہیں۔ داخلہ کے لئے سفارش اور رشوت ضروری ہو چکی ہے کبھی ہم نے سوچا کہ ہم ان مستقبل کے معماروں کو کیا دے رہے ہیں۔ ہمارا پچاس سالہ فرسودہ تعلیمی نظام آج بھی رائج ہے دنیا کہاں سے کہاں جا چکی ہے ہم ہیں کہ ہمیں اپنی پستی بھی بلندی لگ رہی ہے تعلیمی اداروں میں رنگ برنگے جھنڈوں کی تو بھرمار ہے مگر خود پاکستان کا سبز ہلالی پرچم کہیں نظر نہیں آتا۔ سری لنکا جیسے غریب اور چھوٹے ملک میں تعلیمی معیار 95 فیصد سے زیادہ ہے جبکہ ہمارے خوشحال دنیا کی تمام نعمتوں سے مالا مال ملک میں 25 فیصد بھی نہیں ہے ہم صرف اپنا نام لکھنے اور پڑھنے کو ہی پڑھنا لکھنا سمجھ لیتے ہیں۔ صرف امریکا میں جو ہم سے آبادی کے لحاظ سے ڈھائی گنا بڑا ہے۔ ہمارے بجٹ سے 10 گنا زیادہ صرف تعلیم پر خرچ کرتا ہے جبکہ ہمارا 65 فیصد بجٹ صرف اپنے دفاع پر خرچ ہو جاتا ہے۔ بقایا 25 فیصد اپنے قرضوں کے سود اور نئی عیاشیوں پر خرچ ہوتا ہے عوام کے لئے کیا بچا جو ہم ان کی تکالیف دور کرنا تو دور کی بات ہے ہم کم بھی نہیں کرنا چاہتے۔ زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگانا، مہنگائی کو ہوا دینا عام شہری کو اذیت میں مبتلا کرنا ہی ہمارا شعار بن چکا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ ہم نے ان تمام سیاستدانوں کو آزما لیا لیکن کچھ نہیں ملا۔ فوج کو بھی اب آزما رہے ہیں۔ کچھ بہتری کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف چہرے بدل رہے ہیں۔ نظام نہیں بدل رہے ہیں۔ کل بھی تعلیم کے لئے کسی نے کچھ نہیں کیا آج بھی ہم کچھ نہیں کر رہے ہیں کاش وصول کرنے والے یہ اربوں ڈوبے ہوئے روپے ہی صرف تعلیم کے نئے نظام کو روشناس کرانے کے لئے وقف کر دیتے تو کم از کم ایک نئی راہ تو نکل آتی۔ اگر اب بھی ہم نے اپنے فرسودہ نظام تعلیم کو نئے اور جدید نظام تعلیم سے نہیں بدلا تو آنے والی نسل ہم کو کبھی معاف نہیں کرے گی اور پاکستان کا مستقبل بھی ماضی کی طرح اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا غربت، جہالت اور افلاس کے سائے سے اب کون نکالے گا اے اللہ تو نے بھٹکی ہوئی قوموں میں اپنے پیغمبر بھیجے تھے اب پیغمبروں کا سلسلہ تو ختم ہو گیا۔ ایک قائداعظم اور پیدا کر دے جو انگریزوں کی غلامی سے تو نجات دلا گیا اب غربت اور جہالت سے نجات دلا دے اور قوم کی مایوسی اچھے مستقبل میں بدل دے۔

پیٹرول کا عالمی بحران

پوری دنیا میں آج کل پیٹرول کی قیمتیں بڑھ کر 1975ء کے عالمی بحران تک پہنچ چکی ہیں۔ یورپ، امریکا میں تو شاید پیٹرول کے ذخائر بہت کم سطح تک گر چکے ہیں کیونکہ اب سردی کا موسم آنے کو ہے۔ لہٰذا یہ ممالک اپنے ذخائر کافی حد تک بہتر بنا لیتے ہیں۔ مگر اس سال ان ممالک کو کافی تشویش ہے کہ کہیں پیٹرول کی مانگ وہ پوری نہیں کر سکیں۔ اسی وجہ سے ان ممالک کا دباؤ خلیجی ممالک کی طرف بڑھ چکا ہے۔ وہ ان پر دباؤ بھی نہیں ڈال سکتے کیونکہ خود انہوں نے مل کر ان خلیجی ممالک کی پیداوار پر پابندی لگا رکھی ہے۔ حالانکہ خود ان کی ان پیداوار پر اجارہ داری بھی ہے۔ خود امریکہ اپنی کھپت کا بیشتر حصہ اپنے ملک میں پیدا کر لیتا ہے بقایا خلیجی ممالک جس میں سعودی عرب، کویت، امارات، بحرین شامل ہیں وہاں ان کی اپنی اجارہ داری ہے اور وہ خود تیل نکال کر اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے اور اس کے بیشتر منافع پر اس کا کنٹرول ہے یہ ممالک دنیا کی ضرورت کا بیشتر حصہ بھی پیدا کرتے ہیں مگر خود ان کو اس کی اصل قیمت نہیں ملتی۔ پہلی مرتبہ 1975ء میں خود خلیجی ممالک نے اس تیل کی قیمت منوانے میں کافی زور لگایا تو قیمتیں تو بڑھ گئیں مگر پوری دنیا تیل کی سپلائی میں کمی کا شکار ہو گئی تو اس سے افراتفری پھیل گئی۔ تیل کی زبردست کمی (Shortage) ہو گئی۔ پیٹرول کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ مگر عالمی دنیا نے قیمتوں اور سپلائی کو خوب اچھالا اور اسی کی آڑ میں تمام اشیاء جن میں کیمیکل، ادویات، پلاسٹیکل، پیپر، سیمنٹ اور تمام بنیادی صنعتوں میں زبردست اضافہ کا رجحان ہوا جو آج تک برقرار ہے تمام کرنسیوں میں ایسا انقلاب آیا جو آج تک برقرار ہے۔ پسماندہ ممالک اس کی دسترس سے باہر نہیں آ سکے۔ اس عظیم الشان نظام نے پوری دنیا کو تو اتنا نہیں متاثر کیا مگر ان غریب ممالک کی کرنسیوں کو زمین بوس کر دیا۔ مغربی اور امریکن کرنسیاں بے تحاشہ اوپر جاتی رہیں اور کسی کسی کرنسی کی قیمت تو دس سے بیس گنا تک بڑھ گئی۔ پاکستان جیسا غریب ملک 1975ء سے آج تک اپنی قیمت نہیں روک

سکا۔ ڈالر گیارہ روپے سے بڑھ کر آج پانچ گنا جا چکا ہے ہمارے عوام کو پیٹرول کے بڑھنے اور گھٹنے سے آج تک کوئی فائدہ نہیں دیا گیا۔ اگر پیٹرول کی قیمتیں کم ہوگئیں تو بھی ہماری حکومت نے پیٹرول کی قیمت کم نہیں کی۔ مگر قیمتیں بڑھیں تو دوسرے دن ہماری حکومت نے نئے بجٹ کی شکل میں قیمت بڑھا دی۔ یہ کیسا انصاف ہے، کوئی بھی آج تک یہ نہیں جان سکا کہ مشرقی پاکستان کے سیلاب پر لگنے والا امدادی ٹیکس ہماری قوم کیوں ادا کر رہی ہے کیا کسی نے یہ پوچھا کہ ہمارے ملک میں تو اب پیٹرول پیدا ہو رہا ہے تو ہمارے ملک میں اتنی قیمت کیوں زیادہ ہے خود ایران کا پیٹرول صرف 10 روپے فی لیٹر کیوں مل رہا ہے خود سعودی حکومت آج بھی 15 روپے فی لیٹر پیٹرول اپنے ملک میں دے رہی ہے ہمارے ملک میں 26 روپے تو آج مل رہا ہے کل کتنے میں ملے گا اور کب ہماری قوم ملک میں پیدا ہونے والے تیل سے فائدہ اٹھائے گی۔ یورپ اور امریکا میں اس وقت بھی 16 روپے لیٹر دستیاب ہے ہماری حکومت شور مچا رہی ہے کہ دنیا میں پیٹرول کی قیمتیں بہت بڑھ چکی ہیں اس لئے ہم بھی قیمتیں بڑھانے پر مجبور ہیں۔ اگر ہم موازنہ کریں اور قیمتیں بڑھا کر ہم دیکھیں تو قیمتیں اتنی نہیں بڑھیں مگر ٹیکس، ایکسائز، سیلز ٹیکس اتنا زیادہ ہے کہ ہماری قوم اتنے بھاری بوجھ تلے دبتی چلی جا رہی ہے مگر اس غریب قوم کو ان بھاری ٹیکسوں سے کیا سروکار ہے جو ادا کرے۔ اس کو کیا مل رہا ہے۔ کل جب تیل کی قیمتیں پھر گر جائیں گی تو کیا ہمارے یہاں بھی قیمتیں کم کر دی جائیں گی۔ ہمارے ملک میں تیل زیادہ نکلا تو ہم نے کیا اس کو قوم کے مفادات کی خاطر کم قیمت کیا۔ ہم جمہوریت اور دوسری باتیں کرتے ہیں۔ ہماری فوجی حکومت کے لئے یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ پیٹرول مہنگا ہو گیا ہے مگر کیا ہمارے اپنے پیٹرول کے ذخائر کا کسی بھی حکومت نے تجزیہ کیا ہے کہ اگر ہم خود ان ذخائر کو زمین سے باہر نکالیں تو ہمارا ملک پیٹرول اور دوسری معدنیات میں خود کفیل ہو سکتا ہے اگر پیٹرول کے دام بڑھیں تو گیس تو ہماری اپنی ہے بجلی تو ہم خود پیدا کر رہے ہیں۔ لیبر تو اتنی سستی ہے کہ ہم دنیا کا مقابلہ کر سکتے ہیں مگر افسوس کہ ہم صرف اور صرف خود غرضی (Selfishess) کی طرف جا رہے ہیں۔ پوری دنیا اپنی کرنسی کو اتنا بڑھانا چاہ رہی ہے کہ پسماندہ ممالک کل بھی غریب رہیں۔ صرف آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دوسرے امداد دینے والے ممالک کو سوچنا چاہئے کہ اگر یہ ممالک غربت کے اندھیروں سے نہیں نکلے تو کل کون ان سے امداد لے گا، کون ان کو سود دے گا، کون ان کی معیشت کو مضبوط کرے گا یہ خود ان کو سوچنا ہوگا یہ خود ان کے لئے بہتر ہے کیونکہ پیٹرول کا کنٹرول اور قیمتیں قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔

22nd September, 2000

امریکہ میں ایک خطیب کا کارنامہ

گزشتہ ہفتے امریکہ میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ میرے میزبان نے بتایا کہ جمعہ پڑھنے کا مزہ دارالعلوم اسلامی کی جامع مسجد فلوریڈا میں آئے گا جو ہمارے دوست کے گھر سے تقریباً 20 کلومیٹر تھا چنانچہ خطبہ ایک بجے شروع ہوا۔ مولانا صاحب کا تعلق شام (Syria) سے تھا۔ نوجوان خطیب نے عربی میں خطبہ پڑھا پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ایک گھنٹہ تک وہ انگریزی میں مسلمانوں کو جن میں عربی، پاکستانی، ہندوستانی، امریکن اور افریقن شامل تھے۔ اسلام اور دنیا کے بارے میں بڑے بڑے دلائل سے سمجھاتے رہے۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں اتنا پرمغز خطبہ نہیں سنا۔ بہت بڑے بڑے عالموں کے وعظوں سے میں محظوظ ہوتا رہا ہوں۔ مگر اتنا مختصر اور جامع الفاظ کا ذخیرہ اس نوجوان عالم دین سے سن کر اللہ تعالیٰ کی شان دیکھی۔ تمام مسجد مسلمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ اتنی خاموشی اور لگن سے تمام حاضرین ہمہ گوش خطیب صاحب کو سن رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مسجد میں جیسے کوئی بھی نہیں ہے وہ فرما رہے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے کسی صحابی نے سوال کیا کہ حضور ﷺ میں صرف ایک چیز پر عمل کر سکتا ہوں۔ مجھے صرف ایک عمل بتائیے۔ فرمایا کہ سچ بولو کیونکہ میرے بعد اگر کسی کا درجہ ہوگا تو وہ صادقین کا ہوگا۔ یعنی میرے ساتھ جنت میں سب سے نزدیک سچے لوگ ہوں گے۔ حتیٰ کہ شہداء کا درجہ بھی صادقین یعنی سچ بولنے والوں سے بعد میں ہوگا گویا کہ اسلام کی بنیاد سچ پر ہے اور آج اگر ہم دیکھیں تو مسلمانوں نے سچ کو ترک کر کے جھوٹ کو اپنا لیا ہے اور ان غیر مسلموں نے ہمارے تمام اصول اپنا لئے ہیں آج ہم پر کوئی بھی اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں ہے خود اپنے مسلمان ایک دوسرے سے کھل کر جھوٹ بولتے ہیں اور ایک دوسرے کو دھوکہ دینے سے باز نہیں آتے۔ ہمارا آپس کا اعتبار اٹھ چکا ہے۔ غیر مسلم کیسے اعتبار کرے گا۔ وہ مسلمانوں کو جھوٹا، فریبی، مطلب پرست سمجھتے ہیں

جبکہ آپس میں یہ غیر مسلم ایک دوسرے پر اعتبار کرتے ہیں۔ جو بات کرتے ہیں سچ کرتے ہیں اور سچ کی بدولت آج وہ کاروبار میں دنیا میں چھا چکے ہیں۔اورہم پستی کی طرف چلے جارہے ہیں ہمارا اعتبار (Credit)ختم ہوچکا ہے کاروبار میں دکھاتے کچھ اور ہیں اور بھیج کچھ اور دیتے ہیں۔ اگر خراب مال کی نشاندہی بھی کی جائے تو وہ نہیں مانتے اور خراب مال تبدیل نہیں کرتے۔ ایک زمانہ تھا جب اسلام مسلمان تاجروں ہی کے ذریعے سب سے زیادہ مختلف ممالک تک پھیلا کیونکہ تجارت میں مسلمانوں کی مثالیں دی جاتی تھیں کہ وہ زبان کے پکے اور وعدے کے کھرے ہوتے تھے۔ یہودی اور نصاریٰ مسلمانوں کی اس خوبی سے سب سے زیادہ متاثر ہوکر اسلام قبول کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کا بدترین دشمن بھی مسلمانوں کی سچائی کی گواہی دیتا تھا جب عیسائیوں کے شہنشاہ ہرقل نے اسلام کے بدترین دشمن ابوسفیان جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے حضورﷺ کے بارے میں صرف ایک سوال پوچھا کہ کیا وہ سچ بولتے ہیں تو اسلام کا بدترین دشمن ہونے کے باوجود بھی انکار نہیں کرسکا۔ اس نے کہا کہ ان سے زیادہ سچا اور وعدہ کا پکا اصول پرست انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا گویا کہ مسلمانوں کا وتیرہ ہی سچائی پر مشتمل تھا۔ اسی وجہ سے دن رات مسلمانوں کو اللہ نے فتح ہی فتح کی طرف گامزن رکھا۔ مگر جب ہم نے دنیاوی مصلحت میں پڑ کر جھوٹ کو اپنایا۔ آج ہم دنیا میں ذلیل وخوار ہورہے ہیں اور اگر یہی حالت رہی تو نہ معلوم کل کیا ہوگا۔ دوسرا خاص نکتہ اس نوجوان خطیب نے مسلمانوں کو سمجھایا وہ یہ کہ امریکہ میں رہتے ہوئے ان کا حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو امریکی شہری ہونے کے ناطے الیکشن کے لئے رجسٹر کروائیں اور گلی کوچے کے انتخابات سے لے کر نائب صدارت تک کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں کیونکہ امریکن قانون کے تحت صدارت کے لئے صرف کرسچن ہی امیدوار ہوسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ میں یہودی صرف چند لاکھ ہیں جو گلی کے الیکشن سے لے کر ججوں، پولیس، اسکولوں، کالجوں، ایم پی، پارلیمنٹ اور سینیٹ تک جا پہنچے ہیں اور اب کے تو ان یہودیوں کی لابی اتنی مضبوط ہوگئی ہے کہ نئے صدارت کے امیدوار الگور نے تو حد کردی اور اپنا نائب صدر امریکہ کی دوسو سالہ تاریخ کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور اس یہودی نائب صدر کو نامزد کرکے تمام مسلمانوں کو ہی نہیں امریکیوں کو بھی حیران کردیا ہے اگر کسی نے الگور کو قتل کردیا یا اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا تو دنیا دیکھے گی کہ یہ نائب صدر خود بخود نئے انتخابات تک قائم مقام صدر بن جائے گا جبکہ امریکہ میں ڈھائی تین کروڑ مسلمان آباد ہیں اور آج تک کسی بھی معمولی عہدہ پر بھی ایک

مسلمان منتخب نہیں ہوسکا حتیٰ کہ وہ ووٹرلسٹ میں بھی نام نہیں لکھواتے اور الیکشن والے دن اپنے گھر ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ لہٰذا امریکہ کی تمام مسلم تنظیموں نے مل کر متحدہ مسلمانوں کا دن منانے کا اعلان کیا ہے اور آج سے تمام مساجد، مدرسوں، تنظیموں نے متحدہ الیکشن کی مہم (Campaign) چلانے کا اعلان کیا ہے اور تمام مسلمانوں سے تمام اختلافات ختم کرکے صرف اور صرف اپنے آپ کو ووٹرلسٹوں اور الیکشن میں ووٹ ڈالنے کے لئے تیار کرنا شروع کردیا ہے اور آج یعنی جمعہ سے یہ آغاز کیا ہے کہ تمام لوگ نماز سے فارغ ہوکر مسجد کے باہر رضا کار موجود ہیں۔ آپ تمام لوگ فارم پڑھیں۔ یہ بقایا رجسٹریشن کا کام ہماری تنظیمیں کریں گی تاکہ مسلمان بھی مریکہ میں اپنے حقوق استعمال کرکے اپنا مقام بنا سکیں اور پھر جب جمعہ کی نماز ختم ہوئی مسجد کے باہر واقعی رضا کار بڑی تعداد میں مسلمانوں کے فارم بھرنے کے لئے تیار کھڑے تھے اور اکثر لوگ اب ان سے فارم لے کر بھر رہے تھے گویا کہ کم از کم یہ پہلا مرحلہ تو شروع ہوا بعد میں میرے معلوم کرنے پر میرے دوست شہزاد حق جو گزشتہ دس سال سے امریکا میں مقیم ہیں بتایا کہ یہ مسجد اور اسکول انہی عالم دین کی کوششوں سے صرف دو سال میں تیار ہوا ہے اس میں کسی عرب نے بغیر سود کے ادھار روپیہ دیا ہے جس سے یہ اتنی جلدی تیار ہوا ہے اور اب یہاں کے مسلمان اپنی اپنی استطاعت کے مطابق یہ ادھار اتار رہے ہیں اور کافی قرض اتر بھی چکا ہے انہی عالم دین کی رہنمائی میں دو اور اسکول اور مساجد بھی تیار ہورہی ہیں۔ یہ اخبارات میں بھی امریکیوں کے لئے کالم لکھتے ہیں۔ جس میں اسلام کی تبلیغ ہوتی ہے اور اب تو ان کو یہودی مساجد میں بھی وعظ کے لئے بلایا جاتا ہے جو کبھی بھی نہیں ہوتا تھا ان کا ٹیلی ویژن پر بھی کئی مرتبہ خطاب نشر ہوتا رہا ہے جس کی وجہ سے ہر ہفتے کئی امریکن مرد اور عورتیں نوجوان ان کے خطاب سے متاثر ہوکر مسلمان ہورہے ہیں اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کررکھی ہے دن رات مسلمانوں کی ترقی، یکجہتی اور اسلام کی تبلیغ کے لئے یہ اب دوسرے ممالک میں بھی دورے کرتے ہیں اور اسلام کے سنہرے اصولوں کا پرچار کرتے ہیں۔ یہ چندہ خود نہیں لیتے۔ اسی عربی شخصیت کے اکاؤنٹ میں ڈالر جمع کرواتے ہیں۔ ان کا ایک بینک ہے جو نفع نقصان کی بنیاد پر امریکہ میں کام کرتا ہے اور انہوں نے ہی اس مسجد اور مدرسہ کے لئے بغیر نفع لئے قرضہ فراہم کیا تھا جس کا فیض آج امریکہ کے تمام مسلمان اٹھا رہے ہیں۔ نماز کے بعد مولانا کو لوگوں نے گھیر لیا اور وہ سب سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ ان کے مسائل بھی سن رہے تھے اور اس کا حل بھی بتا رہے تھے۔ کاش ہمارے ملک کے عالم دین بھی اس نوجوان خطیب کی پیروی کرتے تاکہ ہمارا پاکستان گروہی اختلافات ختم کرکے پاکستان

کوامن کا گہوارہ بنادے اور تمام مسلمان آپس کے گروہی اختلافات بھلا کر اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک ہو کر اسلام کا قلعہ بنادیں۔ آمین

29th September, 2000

علامہ اقبال کے اشعار گردش میں

آج کل علامہ اقبال مرحوم کے دو اشعار پر بہت بحث ہو رہی ہے اور دونوں اشعار قیام پاکستان سے پہلے کہے گئے تھے۔ کیونکہ علامہ اقبال مرحوم نے پاکستان کا خواب تو دیکھا تھا مگر اس کی تعبیر نہیں دیکھی تھی اور اس وقت وہ خالص ہندوستانی تھے۔ پاکستان کا نام دور دور تک نہیں تھا اور غالباً اسی کی مناسبت سے انہوں نے کہا ہوگا کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اس شعر میں نہ اس وقت کوئی غلط بات تھی اور نہ آج کوئی غلط بات ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت تمام ہندوؤں اور تمام مسلمانوں کا متفقہ پسندیدہ شعر تھا بلکہ ترانہ بھی تھا۔ مگر آج تمام ہندوستانیوں کا جس میں ہندو اور بھارتی مسلمان شامل ہیں۔ ان کا مشترکہ ترانہ ہو سکتا ہے مگر پاکستانیوں کا صرف پسندیدہ شعر ہے اس پر کسی کو اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے بھی ہر شخص کو اشعار غزل گانے کے معاملے میں بالکل اسی طرح کی آزادی ہونی چاہئے۔ جس طرح ہر شخص کو کھانے پینے اور رہنے میں اپنی اپنی پسند کے لئے آزادی رکھتا ہے کسی کو کوئی کھانا پسند ہوتا ہے تو خود اس کے اپنے ہی گھر میں دوسرے افراد کو ناپسند ہوتا ہے اسی طرح کسی کو لال رنگ پسند ہے تو دوسرے کو سفید اور تیسرے کو سبز رنگ پسند ہے اسی طرح لباس کا بھی یہی حال ہے ہم کو سب کی پسند کا احترام کرنا چاہئے اور اس کو غلط انداز فکر کا شکوہ نہیں کرنا چاہئے کہ اگر اس کو لال رنگ پسند ہے تو وہ اشتراکی یا سوشلسٹ قرار دیا جائے اور اگر کسی کو سبز رنگ پسند ہے تو وہ قدامت پسند سمجھا جائے۔ کیا شہناز بیگم نے جیوے جیوے پاکستان نہیں گایا تھا۔ اس وقت ویسے بھی ہمارا ملک ایک طرف تو دولخت ہو چکا ہے اور تاریخ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس میں ہماری غلطی ہی نہیں بلکہ ہٹ دھرمی بھی شامل تھی اگر ہم مصلحت اور ہوش مندی سے کام لیتے اور مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر مشرقی پاکستان کے بھائیوں کی بات سنتے تو یقیناً اس کا معقول حل نکل سکتا تھا۔ ان کے جائز مطالبات مان کر ہم آج بھی ایک

دوسرے کے قریب ہی رہتے اور پاکستان جغرافیائی دوری کے باوجود آج بھی ایک ہوتا۔ خود شیخ مجیب الرحمان بھی آدھے پاکستان پر حکومت کرنے کے بجائے پورے پاکستان پر حکومت کرنے پر کیوں نہ آمادہ ہوتا۔ خود ہم نے اقلیت میں ہونے کے باوجود 1971ء تک یعنی 24 سال تک بنگالیوں پر حکومت کی اور جب خاص طور پر انہوں نے اکثریتی صوبے کی وجہ سے الیکشن بھی جیت لیا تھا تو ان کو حکومت بنانے کی دعوت دینا ان کا اخلاقی قانونی حق بن چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں کبھی غدار نہیں کہا۔ کبھی اعتراض نہیں کیا کہ آپ اقلیت میں ہونے کے باوجود کیوں ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ مگر ہم نے جب بھی اپنے مفادات کو ہاتھ سے جاتے دیکھا تو فوراً غدار کا لیبل لگا دیا اور پھر اس کی سرعام تشہیر بھی کرنی شروع کر دی اور تذلیل بھی۔ یہی سب کچھ سرحد میں خان عبدالولی خان کی پارٹی کے ساتھ بھی کیا گیا۔ شروع ہی سے انہیں غدار کہا جاتا رہا۔ پھر یہی کھیل سرحد سے نکل کر بلوچستان میں بھی کھیلا گیا۔ ان کو بھی پہاڑوں پر چڑھنا پڑا۔ ان کی باتیں سننے کے بجائے ان کی اکثریت حکومتوں کو ختم کر دیا گیا پھر ایسے الیکشن کروائے کہ اکثریت اقلیت میں تبدیل ہوگئی۔ ان کو کسی نے بھی مذاکرات کی دعوت نہیں دی بلکہ ان کو غداروں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔ یہ کھیل اب سندھ میں شروع کر دیا گیا ہے۔ ہم دنیا بھر کی باتیں سنتے ہیں خود ہندوستان کو کشمیر کے معاملے میں مذاکرات کی دعوت دیتے ہیں۔ جب وہ مذاکرات سے بھاگتا ہے یا انکار کرتا ہے تو ہم اس کو عالمی سطح پر برا بھلا کہتے ہیں۔ عالمی اداروں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ یو این او (UNO) میں فریادیں کرتے ہیں۔ امریکہ کو فلسطین کا واسطہ دیتے ہیں کہ جس طرح اس نے فلسطین کا مسئلہ حل کیا اسی طرح وہ کشمیر کے لئے بھارت کو تیار کرے اور مذاکرات سے اس مسئلے کو حل کرے تو دوسری طرف خود ہم اپنے ہم وطنوں کی شکایتیں بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ آج تک کسی بھی پیمانے پر ان کو مذاکرات کی دعوت تک نہیں دیتے۔ ان کی جائز شکایتیں کون دور کرے گا، ان کا احساس محرومی بڑھتا جا رہا ہے ان کے زخموں پر مرہم کے بجائے غداری کے نشتر چلائے جا رہے ہیں۔ پہلے یہ سب الگ الگ اپنی آوازیں بلند کرتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی بھی ہمارا مسئلہ حل کرنا تو کجا سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہے تو انہوں نے مشترکہ جدوجہد کا راستہ تلاش کرنا شروع کر دیا اور یقیناً ہمارا ازلی دشمن ان کو اور ہوا دے گا۔ اگر حقیقت کا چشمہ لگا کر دیکھا جائے تو بھارتی کلچر زی ٹی وی سے شروع ہوا اور آج تمام چینل چپکے چپکے آہستہ آہستہ ہمارے اکثریتی گھروں میں داخل ہو چکے ہیں۔ جہاں جہاں ڈش پہنچ گئی وہاں ان کا کلچر، فلمی ناچ

گانے، فلموں کے ذریعے ہماری نسلوں میں رچ بس گئے ہیں۔ انہوں نے کمال ہوشیاری سے تین سال کے بچے سے لے کر 70 سال کے بوڑھے تک کے لئے مختلف چینلوں سے اپنے پروگرام دکھا دکھا کر بالواسطہ (Indirect) تو ہمیں آدھا بھارتی بنا دیا ہے اگرچہ وہ ہندی کو اردو نہیں کہتے مگر اس ہندی میں 90% اردو کی آمیزش کر کے ہندی پروگرام کا نام دیتے ہیں اور ہم صبح سے رات گئے تک یہ نام نہاد ہندی پروگرام، فلمیں، کارٹون دیکھ دیکھ کر مجھ سمیت سب بہت خوش ہو رہے ہیں۔ پاکستانی چینل سے خبریں اب ہم کو زہر لگتی ہیں۔ زی ٹی وی کی خبریں ہم بڑی باقاعدگی سے سنتے ہیں۔ ہماری مارکیٹیں ان کے اشتہاروں کی وجہ سے ان کے مالوں سے بھری پڑی ہیں۔ کون سی اشیاء ہیں ان کی جو ہماری مارکیٹوں میں نہیں ملتیں اگر کوئی شاذ و نادر ملے تو ہم کسی بھی آنے جانے والے سے فرمائش کر کے منگوا لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں سے پاکستان کا بنا ہوا کوئی بھی مال ہندوستان نہیں جاتا۔ البتہ سپاری، گندم، چینی، ضرور اسمگلنگ ہو رہی ہے جو خود ہم امپورٹ کرتے ہیں گویا ہم اپنا غیر ملکی زرمبادلہ خرچ کر کے ہندوستانی کرنسی میں فروخت کر رہے ہیں۔ ہماری معیشت تو بیٹھ ہی چکی ہے اب تہذیب و تمدن بھی داؤ پر لگ چکا ہے۔ خدارا حقیقت سے کام لیں ملک ہمیشہ فوجیوں کے دور میں ٹوٹتے ہیں جمہوری دور میں کبھی نہیں ٹوٹتے۔ سیاست دانوں کو کونے میں کر دینے سے حکومت چلانا اب ناممکن ہوتا جا رہا ہے ویسے بھی ایک سال میں کوئی کارنامہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ مہنگائی اوپر سے ٹیکس ٹیکس کی صدائیں مایوسی کے بادل پھیلا رہی ہیں۔ عوام کی قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔ تمام سیاستدان، ایم این اے، ایم پی اے، سینیٹر تو چور نہیں ہیں اور اب تو فوجیوں پر بھی انگلی اٹھائی جا چکی ہے۔ ماضی کی غلطی کو دہرانے کے بجائے ان بگڑے ہوئے اور بپھرے ہوئے سیاستدانوں کو مذاکرات کی میز پر بلایئے قبل اس کے کہ عوام ان کی لبیک کو ہی اپنی نجات سمجھ کر ان کے پیچھے بلا سوچے سمجھے چل پڑیں۔ جمہوری انداز سے ان گمبھیر مسائل کو مذاکرات کی میز پر فوری طور پر حل کر لیں۔

2002ء تک اب صبر کی زنجیر ٹوٹتی نظر آ رہی ہے۔ خدا خیر کرے صرف گیارہ مہینے میں ہی مایوسی چھا چکی ہے۔ کہیں خوشۂ گندم کے جلنے کی ماری نہ آ جائے۔

06th October, 2000

خزانوں کے عزیز

گزشتہ دس سال میں ہمارے وطن عزیز میں اپنا خزانہ نہ ہونے کے باوجود دو عزیز آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دیگر امداد دینے والے ممالک کے دیئے ہوئے خزانوں پر وزیرِ داخلہ نامزد ہوئے۔ پہلے وزیرِ خزانہ سرتاج عزیز، بار بار یعنی نواز شریف کے دونوں ادوار میں وزیرِ خزانہ رہے۔ انہوں نے کبھی عوام کی بات سن کر ہی نہیں دی کیونکہ ان کا تعلق کبھی عوام سے نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ عوام کے ووٹوں کے بغیر ہی قومی اسمبلی میں پہنچ جاتے تھے۔ ان کا نام تاریخ میں ایٹمی دھماکہ کے عوض فارن کرنسی اکاؤنٹ منجمد کرنے کا کارنامہ کوئلے سے کالی سیاہی کے حروف سے لکھا جائے گا اور عوام اس کو اگر بھلانا بھی چاہیں تو بھلا نہیں سکیں گے۔ وہ دن ہماری کرنسی کا جنازہ نکالنے کا سب سے بڑا سبب بنا اور وہ جنازہ اب ہر روز صبح سویرے روپے پیسوں میں نکلتا رہتا ہے۔ اب تو عوام اس کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ جس طرح موت کا ایک دن معین ہے اسی طرح ہمارے روپے کا ایک دن مقرر ہو چکا ہے جو کسی بھی دن ترکی، اٹلی، انڈونیشیا کی طرح پیسوں میں تبدیل ہو جائے گا۔ سرتاج عزیز صاحب کے دور میں بھی پہلے سالانہ بجٹ، پھر منی بجٹ اور آخر دور میں ہفتہ وار بجٹ سے ڈیلی بجٹ پر نوبت آ گئی تھی۔ صبح کا اخبار پڑھتے ہوئے لوگ ڈرنے لگے تھے کہ خدا خیر کرے کہ پیٹرول، گیس، بجلی جوان کے گھر کی لونڈی تھی کہیں اس پر سرتاج کا سرچارج تو نہیں لگ گیا اور ان دنوں خود ان کے یار دوست بھی سرچارج عزیز کہنے لگے تھے۔ ان کا اپنا ایک انداز ہوتا تھا جس دن وہ ان کے نرخ بڑھاتے تھے تو بیچارے اخباری نمائندے ان سے اس مہنگائی کے دور میں مزید عوام پر بوجھ قرار دیتے تھے تو وہ مسکرا کر کہتے تھے اس معمولی اضافے سے عوام پر اثر نہیں ہوگا۔ اسی دور میں، میں نے جل کر ایک کالم بھی لکھ دیا تھا کہ اس کا اثر عوام پر نہیں تو فرشتوں پر پڑے گا۔ گویا انہوں نے عوام کو ایک بیوقوف مخلوق سمجھ کر نظر انداز کر رکھا تھا۔ صرف ایک ہی جملہ ان

کی زبان پر رہتا تھا کہ عوام نے ان کو پانچ سالوں کے لیے مینڈیٹ دے رکھا ہے۔ لہٰذا وہ فٹ بال سمجھ کر اس مینڈیٹ سے کھیلتے رہے اور وہ 12 اکتوبر کی شام کو فٹ بال پھٹ گیا۔ ساری ہوا باہر نکل آئی۔ پوری ٹیم ایک ہی دن میں مینڈیٹ کپ کو میدان سیاست میں چھوڑ کر باہر بھاگ گئی آج تک وہ مینڈیٹ کا نام لینا تو کجا دل کے ٹکڑوں کی طرح کوئی یہاں گرا کوئی وہاں۔ اب تو مسلم لیگ کی سیاست کا سارا وزن ایک خاتون پر ڈال کر سب نہ جانے کہاں کھو گئے۔ اس بھری دنیا میں بے چارے کارکن تنہا ہو گئے۔ عوام نے سکون کا سانس لیا کہ چلو ان سیاستدانوں سے جان چھوٹ گئی۔ فوج نے اقتدار ان بھوکوں ننگوں سے چھین لیا۔ اب مہنگائی ختم ہوگی۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار ختم ہوگا۔ مگر یہ سب بھول گئے کہ خزانہ تو اپنا نہیں بلکہ ایرے غیرے نتھو خیرے قرض دے کر ہمارے حکمرانوں کو عیاشیاں کروا رہے تھے۔ چیف ایگزیکٹو سیدھے سادھے جنرل تھے ان کو معیشت کی نہیں بلکہ عسکری تربیت تھی۔ انہوں نے معیشت سے واقفیت رکھنے والے جناب شوکت عزیز کو وزیرِ خزانہ نامزد کر دیا اور عوام کو زبردست تسلیاں بھی دے دیں ہم دن رات ملک میں بنے والی اشیائے تعیش چائے، چاکلیٹ، بسکٹ، ادویات، گاڑیاں درآمد کرتے رہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک ہمارے قرضوں کا سود وصول کرتے گئے ہماری عزت اور وقار سے بھی کھیلتے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے افسران ہمارے یا اسٹیٹ بینک اور سی بی آر میں بھی لا کر بٹھا دیئے تاکہ وہ اپنی من مانی کر سکیں۔ ہمارے حکمرانوں کو پہلے ٹیکس سروے کے نام پر عوام اور تاجروں کو بھڑوا دیا۔ علماء کو آپس میں لڑوا دیا ان کے کارندے خاموشی سے اس حکومت کے لیے غلط سلط فیصلے کرواتے گئے۔ ٹیکس پر ٹیکس لگواتے گئے۔ حکومت کی نیت اچھی تھی کہ ہر آدمی ٹیکس دے مگر اتنے غلط طریقہ سے اس کا استعمال (Handle) کیا کہ عوام بھی اس حکومت سے بیزار ہوتے گئے یہ تو اچھا تھا کہ یہ وزیرِ خزانہ ماضی کے وزیرِ خزانہ سے مختلف تھے۔ انہوں نے جب محسوس کیا کہ ٹیکس سروے میں گڑبڑ ہو رہی ہے تو اس میں آسانیاں پیدا کر دیں۔ پھر انکم ٹیکس فارم اور عام معافی اسکیم میں غیر ضروری کالم تھے وہ سب ختم کر دیئے تاجروں اور ان کے نمائندوں سے بات چیت کے دروازے کھول دیئے۔ اس سے یہ مسائل تو حل ہو جائیں گے مگر اصل مسئلہ کوئی بھی حل کرنے کے لیے نہیں سوچ رہا ہے۔ اگر ہم حساب لگائیں تو 53 سال میں ہم نے اگر 100 روپے لئے ہوں گے تو ہم آج تک یقیناً 110 روپے سود کے ادا کر چکے ہونگے۔ ہم یہودی طرز سودی نظام کے تابع ہیں۔ امریکہ میں یہ سودی نظام آج تک قائم ہے۔ ان کے 90 فیصد مکانات رہن

(Mortgage) ہیں۔ وہ 30 سال کے لیے سود پر رقم دیتے ہیں۔ پہلے پانچ سال تک صرف سود وصول کرتے ہیں پھر سود اور اصل کی کچھ رقم مختص کر دیتے ہیں اور یہ سود اور اصلی رقم جب تیس سال کو پہنچتی ہے تو وہ چار سے پانچ گنا ہو چکی ہوتی ہے مگر چونکہ وہ تیس سال میں وصول کی جاتی ہے تو وہ خریدنے والے پر ایک دم بار نہیں گزرتی مثلاً اگر ایک مکان دو لاکھ ڈالر کا ہے تو کوئی بھی اس کو یکدم نہیں خرید سکتا۔ لہٰذا وہ اس مکان پر صرف ایک ہزار ڈالر کی وصولیابی کریں گے۔ پانچ سال تک وہ صرف ایک ہزار ڈالر وصول کر لیں گے یعنی پانچ سال میں 60 ہزار ڈالر وصول کرنے کے بعد اب وہ ایک ہزار ڈالر سود اور 500 ڈالر اصل میں سے کٹوائیں گے۔ اس طرح کل 1500 ڈالر ماہانہ کی کٹوتی کسی کو مہنگی نہیں لگتی کیونکہ اگر کوئی اس طرح کا مکان کرایہ پر لے تو عام طور پر اس کا کرایہ بھی 1500 ڈالر ہوتا ہے جب اس کے رہن (Mortgage) کا وقت آئے گا تو تیس سال تک اصل رقم + تیس سال تک سود اور سود پر سود تو ہو گا ہی مگر دوسرے چارجز وغیرہ وغیرہ ڈاکومینٹیشن کے نام پر بھی رقم وصول ہو گی۔ اس دوران اگر آپ رقم نہیں جمع کرا سکے تو وہ مکان فوری طور خالی کروا کر تمام جمع شدہ رقم خواہ وہ کتنے سال کی ہو وہ بحق بینک ضبط ہو جائے گی یہ فارمولا بھی ہمارے معاملے میں لاگو ہوتا ہے۔ اے قوم کے سیانو، سوچو اسلام نے سود کیوں حرام قرار دیا تھا کیوں قرض کی لعنت سے بار بار روکا تھا۔ اگر ہم نے تمام غیر ضروری امپورٹ کو نہیں روکا تو ہمارا روپیہ پیسے میں تبدیل ہونے کو ہے۔ اب صرف 34 روپے باقی ہیں۔ ڈالر 5 روپے سے 66 روپے آ چکا ہے۔ سو روپے ہو گیا تو ہمارے روپے کی قیمت صرف ایک پیسے کے برابر عالمی منڈی میں ہو جائے گی۔ پھر اس کے بعد گنتی شروع اور قرضے لینے والوں کا انجام ہمارے سامنے ہے خود جنرل صاحب سب سے پہلے عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرح اپنے گھر سے سادگی شروع کریں۔ تمام غیر ضروری اخراجات بشمول صدر، فوج، وزراء، سفراء، بیوروکریٹ، سرکاری، نیم سرکاری افسران کو دیکھ کر ہی عوام اس کی طرف راغب ہوں گے۔ افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے پہلے طالبان کے چیف ایگزیکٹو جناب ملا عمر صاحب نے ایک سالن اور عام روٹی اپنے رفقاء مشیرانِ حکومت کی عہدیداران میں شروع کروائی۔ آج وہ کسی بھی امریکن دھمکی پر کان نہیں دھرتا۔ کیونکہ وہ مقروض قوم نہیں ہے۔ ان کی سادگی دیکھنے کے قابل ہے۔ ایک مرتبہ سعودی عرب کے شاہ فیصل مرحوم کو امریکہ نے دھمکی دی تھی جب ان کا کوئی ''بڑا'' سعودی عرب کے دورے پر آیا تو انہوں نے ریت کے میدان میں اس کا رات کا کھانا کیا اور قیام بھی کروایا۔ اس کو بڑا تعجب ہوا کہ اتنے محل

ہوتے ہوئے اس کو جنگل میں خیموں میں کیوں ٹھہروایا گیا اور خود شاہ بھی اس خیمے میں ٹھہرا صبح جناب شاہ فیصل سے جب اس نے پوچھا تو انہوں نے فرمایا اگر تم ہم پر اسی طرح تیل کی اجارہ داری قائم رکھو گے تو ہم واپس اپنے مقام پر یعنی خیموں میں چلے جائیں گے مگر عوام کو تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ مگر تم کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ تو ایک مرتبہ آپ آئی ایم کو آئینہ دکھا دیں۔ برازیل والوں نے بھی صرف آئینہ دکھایا تھا۔

جناب شوکت عزیز صاحب وہاں بھی سرکاری تنخواہیں ڈالر کی مناسبت سے جوڑ دی گئی تھیں۔ آپ نے بھی ایسا ہی اپنے بیان میں سرکاری ملازموں کو عندیہ دیا ہے کہ تنخواہیں ڈالر سے منسلک کر دی جائیں گی۔ عوام کیا کریں گے۔ نجی شعبہ کہاں سے ڈالر لائے گا۔ آپ عوام کی خواہش کا احترام کرتے ہیں۔ کیا سادگی کا قانون نافذ نہیں کر سکتے۔ صرف نئے قرضے ہی لینا چھوڑ دیں پھر دیکھیں یہی آئی ایم ایف والے آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے کہ آپ قرض کیوں نہیں لے رہے۔ ان کا تو کاروبار ہی ہمارے قرضوں کا مرہونِ منت ہے۔

13th October, 2000

سڈنی اولمپکس اور ہماری شکست

ایک وقت پاکستان کی تاریخ میں کھیلوں کے میدان میں ایسا بھی آیا کہ ہم پانچ عالمی چیمپئن تھے جس میں ہاکی، کرکٹ، اسنوکر، کشتی رانی اور اسکواش شامل تھے۔ ایک آدھ تمغہ ہمارا ایک باکسر بھی کسی نہ کسی طرح لے ہی آیا تھا۔ پھر کیا تھا ہم نے اس پر محنت کرنا چھوڑ دیا۔ ہاکی میں سیاست آ گئی۔ کرکٹ میں جوا ہونے لگا۔ اسکواش میں اکیلا جان شیر خان کب تک مقابلہ کرتا۔ پی آئی اے نے اس کے لئے اپنے فنڈ کم کر دیئے۔ حکومت نے سرپرستی چھوڑ دی۔ ہم نمبر ایک سے دو اور اب تو دور دور تک ہمیں کوئی امید نظر نہیں آتی جو جان شیر خان کا نعم البدل مل سکے۔ اسنوکر جیتنے والے کے خلاف خود اس کی فیڈریشن کے صدر اور ممبران پیچھے پڑ گئے۔ ہم کسی کو انعام تو نہیں دے سکتے البتہ اس کی بے عزتی کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ ہائے بیچارہ محمد یوسف اس بے عزتی کے باوجود کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی طرح پھر پاکستان کا نام روشن کر سکے۔ رہ گئی کشتی رانی، وہ تو ہم نے تکے میں سونے کا تمغہ جیت لیا تھا کیونکہ ہماری سرکاری ٹیم ہار گئی تھی۔ وہ تو پاکستان کے آزاد کشتی رانوں نے پاکستان کی طرف سے غیر سرکاری طور پر حصہ لیا اور جیت گئے تو ہم نے وہ کریڈٹ بھی اپنے کھاتے میں ڈال دیا۔

اس سال سڈنی اولمپک ہوئے اور خوب ہوئے۔ ہم آہستہ آہستہ اپنے تمغے گنواتے گئے اور ایک ایک کر کے عالمی اعزازات سے محروم ہوتے گئے۔ ہماری اولمپک ٹیم جب واپس آئی تو اپنے ساتھ کوئی تمغہ تو نہ لا سکی بلکہ اپنے دو باکسر سڈنی کھو آئی۔ اب وہ بے چارے سردی میں نہ جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ سڈنی پولیس اور ہمارے سفارت خانے کے عملے والے ایک ایک گلی ان کی تلاش میں پھر رہے ہیں وہ تو خیر ہوا ان کے صدر انور چوہدری صاحب کی کہ انہوں نے کہہ دیا ہے وہ باکسر کہیں نہیں جائیں گے اور جلد پاکستان واپس

آ جائیں گے لوگ پوچھتے ہیں جب بھاگ کر واپس ہی آنا تھا تو پھر بھاگے کیوں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اکیلے رہ رہ کر پریشان ہو جائیں گے پھر وہاں شادیاں کر لیں گے پھر ان کے بچے ہو جائیں گے۔ تب جا کر وہ اپنے بچوں کی شادی کے لئے رشتہ تلاش کرنے واپس پاکستان آئیں گے۔ سڈنی اولمپکس میں صرف ہماری ہاکی ٹیم شروع کے تمام میچوں میں نہیں ہاری۔ البتہ سیمی فائنل میں ہار کر چوتھی پوزیشن حاصل کر کے سالم ناک کٹنے سے بچا دی۔ یار لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں امپائر کی جانبداری قابل دید تھی۔ اس لئے ایشیا کو یورپین جتوانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ لہٰذا امپائر کے زیادہ تر فیصلے ہمارے خلاف گئے اور ہم ہار گئے۔ اکیلا بے چارہ اصلاح الدین کب تک ان امپائروں کو سمجھاتا اور کب تک مقابلہ کرتا اور اسی طرح بقول شاعر۔

''بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے''

اب دیکھنا یہ چاہئے کہ ہمارے کھیلوں کے کرتا دھرتا کب تک ہمیں اس شرمندگی سے دوچار کرتے رہیں گے۔ ان کی سیاست، اقربا پروری، رقموں کا ہاضمہ کب تک جاری رہے گا۔ حکومت سالانہ کروڑوں روپے ان پر خرچ کرتی ہے جو ان کی فیڈریشن، ایسوسی ایشن کے سرکردہ افراد مل ملا کر کھا لیتے ہیں۔ بہت کم حصہ بے چارے ناتواں کھلاڑیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ ان کی تذلیل کرتے ہیں۔ اگر وہ جیت جائیں تو سارا کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور اگر ہار جائیں تو یا وہ کھلاڑیوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں یا پھر امپائروں پر غصہ اتارتے ہیں۔ اپنی غلطی کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو پاکستان کی عزت و ناموس کا خیال نہیں ہوتا۔ صرف اپنی گدی کی حفاظت اولین ترجیحات میں ہوتی ہے۔ اول تو ہمارے ملک میں اسپورٹس کے میدان بہت کم ہیں جو ہیں وہ انٹرنیشنل معیار کے نہیں ہیں۔ اگر کھلاڑی ہیں تو کھلانے والے صحیح ٹریننگ نہیں دیتے۔ اب کھیل کا معیار بہت تبدیل ہو چکا ہے۔ نئے نئے قوانین آ چکے ہیں نئی نئی تکنیک آ چکی ہیں۔ میڈیا سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ وڈیو اور بڑے بڑے اسکرین کی مدد سے آپ اپنے کھیل میں نکھار لا سکتے ہیں۔ اپنی غلطیاں خود دیکھ کر دور کر سکتے ہیں۔ سامنے والی ٹیم کی تکنیک اپنا کر ان کو ہرایا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس ہر میدان میں ہم پیچھے جا رہے ہیں۔ ہمارے کھیلوں کے بچے ہوئے میدان قبضہ مافیا کے ہاتھوں ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سارا کام انتظامیہ کی ملی بھگت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے کوئی اس کو روکنے والا نہیں ہے اگر کوئی روکنا چاہے تو مافیا خود اس کا صفایا کر دیتی ہے فوج کس کس معاملے میں مداخلت کرتی پھرے۔ ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں اور کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ہم

ان کو کیوں پورا نہیں کرتے۔

اب یہ دیکھا جائے کہ ہم سے چھوٹے چھوٹے ممالک تمغوں کے انبار لئے واپس آئے کیوبا جیسا غریب ملک 29 تمغے لایا جس میں گیارہ سونے کے تمغے شامل تھے۔ کینیا نے 7 تمغے لئے جن میں 2 سونے کے تمغے تھے۔ سعودی عرب، قطر، کویت، چلی، کیمرون، نائیجیریا اور کل آزاد ہونے والی ریاستیں تمغے سمیٹ رہی تھیں اور ہم خالی ہاتھ اپنے بڑے ملک پاکستان جس کی آبادی پندرہ کروڑ ہے۔ لاکھوں افراد والے ممالک سے بہت پیچھے اپنی سرزمین پر بغیر کسی شرمندگی کے اتر رہے تھے۔ ہمارا ایک مرتبہ بھی قومی ترانہ سٹڈنی میں نہیں بجا۔ تعلیم کے میدان میں تو ہم پہلے ہی بہت پیچھے ہیں۔ اب کھیل کا میدان بھی ہمارے ہاتھ سے جا چکا ہے اور ہمیں کوئی فکر بھی نہیں ہے۔ ہم صرف اس بات پر بہت خوش ہیں کہ اگر ہم کوئی تمغہ نہ لا سکے تو کیا ہوا۔ بھارت بھی تو صرف ایک کانسی کا تمغہ جیت سکا وہ تو ایسا ہی ہے کہ ایک بچہ اسکول میں فیل نہیں ہوا۔ میرا کلاس کا مانیٹر بھی فیل ہوا ہے۔ کیا ہم اس شکست سے سبق حاصل کرنا چاہیں گے یا پھر بھول جائیں گے۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی اپنی غلطیوں کی سمت درست کریں اور ہم 2004ء میں ہونے والے ایتھنز اولمپکس کی بھرپور تیاری کریں۔ اس کے لئے ہمارے پاس چار سال پڑے ہیں ان کے ایک ایک دن سے فائدہ اٹھائیں۔ امریکہ کے لمبے لمبے کالے اتنے سونے کے میڈل بھاگ دوڑ اور دوسرے کھیلوں میں لے سکتے ہیں تو کیوں نہ ہم پنجاب اور سرحد کے ان علاقوں سے جہاں ہمارے طویل قامت نوجوان رہتے ہیں ان کی تربیت کا بندوبست کریں چھوٹے سے لے کر درمیانی عمر تک کے نوجوان اگر آج سے ٹرین کرنا شروع کریں تو ایک دو اولمپکس کے بعد ہم بھی شوٹنگ بال، والی بال، گھڑ دوڑ سوئمنگ اور دوڑ میں یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں۔ صرف اور صرف محنت، لگن، حوصلہ کی ضرورت ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ صرف اولمپکس کے لئے ماضی کے ہمارے اچھے اچھے ریٹائرڈ کھلاڑیوں پر مشتمل ایک بورڈ بنایا جائے جو ہمارے کھیلوں پر توجہ دے اور جو کھیل ہمارے ملک میں نہیں کھیلے جاتے ان کے سکھانے والے (Trainers) باہر سے بلوا کر کہ ان سے کوچنگ کروائی جائے تا کہ پاکستان کا نام ایک مرتبہ پھر کھیل کے میدانوں میں گونجے اور ہم کھوئے ہوئے تمغوں کے ساتھ نئے نئے تمغے بھی لا سکیں۔

20th October, 2000

اللہ خیر کرے

جنرل ضیاء الحق کے بعد جب دوبارہ جمہوری دور شروع ہوا تو لوگوں کا خیال تھا کہ سیاستدان اس جمہوریت کا فائدہ اٹھا کر عوام کی تکالیف دور کریں گے۔ ملک میں آمریت یعنی فوجی حکومت نہیں آ سکے گی۔ مگر ہر مرتبہ ڈھائی تین سال بعد حکومت کرپشن کے نام پر توڑ دی جاتی پھر الیکشن کروائے جاتے پھر عوام دونوں بڑی پارٹیاں یعنی مسلم لیگ اور پی پی پی میں سے کسی ایک کو دوبارہ منتخب کروا دیتی۔ ہارنے والی جماعت جیتنے والی جماعت پر دھاندلی کا الزام لگا دیتی پھر اسمبلیوں میں خرید و فروخت شروع ہو جاتی۔ فلور کراسنگ یا توڑ جوڑ سے حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی یا پھر توڑ دی جاتیں۔ کبھی سپریم کورٹ بحال کرتی کبھی ہائی کورٹ۔ الزام یہ تھا کہ سیاستدان کرپٹ ہیں۔ مگر الیکشن میں عوام پھر سے ان کو چن لیتے۔ دو دو اور دونوں بڑی جماعتوں کو مل چکے تھے۔ کرپشن عروج پر تھی۔ ہمارا ملک کرپشن میں دوسرے نمبر پر آ گیا تھا اور نائیجیریا کا پہلا نمبر تھا۔ غالباً نائیجیرین صدر نے کرپشن کا تعین کرنے والوں کو بھی رشوت کی پیشکش کر دی ہوگی اور چونکہ ہماری حکومتوں کو تو پتہ تھا کہ ہم سے زیادہ اور کون کرپٹ ہو سکتا ہے لہٰذا انہوں نے کرپشن کا تعین کرنے والوں کو غالباً رشوت کی پیشکش نہیں کی ہوگی۔ اس وجہ سے پہلے نمبر پر آنے سے رہ گئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیاستدانوں کو کرپشن کی عادت کس نے ڈالی۔ سب سے پہلے جنرل ضیاء الحق نے 50 لاکھ فی ایم این اے کی صوابدید پر ترقیاتی فنڈ کے نام پر ان غیر جماعتی سیاستدانوں کو استعمال کیا۔ ہر بڑی پوسٹ پر ریٹائرڈ جنرل لگا دیئے۔ صوبائی گورنر تمام کے تمام فوجی تھے۔ بعد میں تو کچھ پر منشیات کی اسمگلنگ کے الزام لگے۔ ایک گورنر نے جام صادق علی مرحوم کو چپکے سے فرار کروایا۔ مگر جنرل ضیاء الحق کے دبدبے میں تمام کرپشن دبے رہے۔ سیاستدان 50 لاکھ والے بجٹ کو 25 سے 30 فیصد تک کمیشن لے کر

کھاتے گئے اور بعد میں یہ تمام غیر جماعتی سیاستدان سب کے سب مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ کرپشن کی عادتیں بڑھتی گئیں۔ پھر جب ضیاء الحق کی حکومت ختم ہوئی تو پی پی پی کی حکومت بنانے میں بڑی توڑ جوڑ ہوئی کیونکہ کسی کے پاس اکثریت نہیں تھی۔ نہ اکیلی مسلم لیگ حکومت بنا سکتی تھی اور نہ ہی پی پی پی۔ لہٰذا اس توڑ جوڑ نے کرپشن کی ابتداء کی۔ کروڑوں روپے خرچ کر کے اسمبلیوں میں آنے والے کس طرح کرپشن سے دور رہ سکتے تھے۔ آخر ان کو اپنا سرمایہ جو الیکشن میں لگایا تھا۔ واپس وصول کرنا تھا۔ لہٰذا دھڑا دھڑ فلور کراسنگ شروع ہوئی۔ فاٹا کے آزاد امیدواران نے بھی کام دکھایا اور اس طرح مختلف خیالات کے لوگ حکومت میں شامل ہوگئے۔ تب جا کر پہلی پی پی پی کی حکومت بنی اور جلد ہی پی پی پی کے ووٹوں سے آنے والے صدر اسحاق خان نے خود پی پی پی کی حکومت پر کرپشن کا الزام لگا کر ڈھائی سال میں چلتا کر دیا۔ جتوئی صاحب کو عارضی وزیراعظم بنا کر الیکشن کروایا۔ اس طرح مسلم لیگ واپس آ گئی۔ جتوئی صاحب پر بھی الزام لگا کہ الیکشن میں دھاندلیاں ہوئیں۔ کس نے یہ دھاندلی کروائی اور کس نے منصوبہ بندی کی۔ اکثریت نے ایجنسیوں کو مورد الزام ٹھہرایا۔ مگر مسلم لیگ کی حکومت بھی قبل از معیاد ختم کر دی گئی۔ ان پر بھی کرپشن کا الزام لگایا۔ پھر سپریم کورٹ نے مداخلت کی اور مسلم لیگ کی حکومت بحال ہوگئی۔ صدر غلام اسحاق خان نہیں مانے۔ آخر دونوں صدر اور وزیراعظم مستعفی ہوگئے۔ پھر الیکشن کروائے گئے۔ معین قریشی صاحب کو امریکہ سے بلوا کر نگراں وزیراعظم بنایا گیا۔ الیکشن کمیشن کا رزلٹ اب کے پی پی پی کے حق میں گیا۔ نئے صدر پھر پی پی پی کے ووٹوں سے فاروق لغاری صاحب بنے۔ انہوں نے بھی اپنی ہی پارٹی کی حکومت کو آدھی میعاد سے ہی پہلے ختم کر دی۔ گویا پی پی پی دوسری مرتبہ اپنے لائے ہوئے صدر کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ وہی الزام کہ زبردست کرپشن تھی۔ وزیراعظم پر کم ان کے شوہر آصف علی زرداری پر زیادہ کرپشن کا الزام لگایا گیا۔ تمام وزراء بیوروکریٹ، پی پی پی کے دور میں زبردست کرپشن میں ملوث بتائے گئے۔ پھر الیکشن ہوئے۔ مسلم لیگ نے اگرچہ صرف 14 فیصد ووٹ حاصل کئے۔ بقایا جماعتوں نے 12 فیصد ووٹ حاصل کئے۔ مگر دو تہائی اکثریت مسلم لیگ کو ملی جس کو تاریخ میں سب سے بڑے مینڈیٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تمام حکومتیں کرپٹ تھیں تو پہلے نگراں وزیراعظم جتوئی صاحب اور دوسرے نگراں وزیراعظم معین قریشی صاحب نے ان کرپٹ سیاستدانوں کا محاصرہ کیوں نہیں کیا۔ انہیں کیوں کھلے رہنے دیا۔ خالی الزامات سے کیا فائدہ ہوا۔

علاج کرنے کے بجائے مرض کو بڑھایا گیا۔ جس سے ان کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔ کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں تھا۔ عوام مہنگائی سے تنگ اور پسے جا رہے تھے۔ اس وجہ سے وہ تو خاموش رہے اور ان کرپٹ سیاستدانوں کو بار بار اسمبلیوں کے لئے منتخب کرتے گئے۔ عوام کا اس میں کیا قصور تھا۔ چلو اگر عوام مان لیں کہ سیاستدان کرپٹ تھے۔ مگر اب ایک سال ہو چکا ہے۔ 12 اکتوبر آ کر گزر گیا۔ عوام نے پچھلے 12 اکتوبر پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ مگر اس 12 اکتوبر پر نہ خوشی تھی اور نہ غم۔ اگر ہماری انتظامیہ بلاوجہ مستعدی نہ دکھاتی اور کلثوم نواز صاحبہ کو جلوس نکالنے دیتی تو چند سو مسلم لیگی افراد سے زیادہ لمبا جلوس نہ نکلتا۔ ہمیشہ کی طرح زبردست ناکہ بندی، بے جا لاٹھی چارج، ہماری پولیس خود مواقع فراہم کرتی ہے۔ قوم مایوسی میں غرق پڑی ہے اس کو سکتہ ہو چلا ہے۔ مریض کی نبض کی طرح ڈوبی جا رہی ہے۔ مہنگائی سے زیادہ مایوسی نے پریشان کر رکھا ہے۔ بزنس مین کے پیچھے سروے سروے کی دوڑ اور غریب کو بجلی اور پانی سے محروم کر رکھا ہے واپڈا نے تو ریکوری (Recovery) کے نام پر رشوت اور ظلم کا بازار پورے ملک میں برپا کر رکھا ہے۔ جس کو چاہے جتنے کا بل بھیجیں اور پیچھے بندے آ جاتے ہیں کہ ہم یہ بل ٹھیک کروا سکتے ہیں فوج کے نام پر رشوت کا بھاؤ بڑھ چکا ہے۔ روز روز بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے ہر کوئی پریشان ہو چلا ہے جبکہ بڑی بڑی سڑکوں پر دن میں بلب روشن رہتے ہیں۔ حکومت کے ان یوٹیلیٹی بلز جمع کرانے والے گھنٹوں دھوپ میں بینکوں کے باہر لائن لگائے پسینوں میں نہائے ہوتے ہیں اگر بل نہ جمع کرائیں تو بجلی منقطع اور جرمانے اور گرفتاریوں کا سلسلہ ہوتا ہے۔ اگر جمع کروانے جائیں تو سارا سارا دن خوار، نمبر آنے پر کبھی لنچ کا وقفہ اور کبھی بینک بند ہونے کا وقت آ جاتا ہے بینک عملہ بھی بری طرح پیش آتا ہے مہذب دنیا میں تو ٹیکس اور بل کی وصولیابی پر مراعات دی جاتی ہیں۔ ہم ٹیکس اور بلوں کی وصولیابی کو عذاب بنا چکے ہیں۔ ہر معاملہ میں بیوروکریسی اپنا Upper Hand رکھنا چاہتی ہے تاکہ عوام ان کی صوابدید کے محتاج رہیں۔ آسان قواعد اگرچہ حکومت کی کوشش ہوتی ہے مگر وہ حکومت کو ڈرا کر آخر فیصلہ اپنے حق میں منوا لیتی ہے۔ فوج کا احترام داؤ پر لگنے کو ہے۔ حکومت کی نیت بے شک ٹھیک ہے مگر ارباب اختیار صحیح سمت متعین نہیں کر سکے۔ معاشیات اور قرضے ہم کو کھائے جا رہے ہیں۔ احتساب سے عوام کو کیا فائدہ پہنچا۔ روز کسی نہ کسی سیاستدان کو کرپشن میں سزا ہو رہی ہے مگر اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب یہ لوگ بڑی عدالتوں میں اپیل میں بری ہو جاتے ہیں۔ قانون کی شقوں سے اور دوسری طرف کاغذی

کارروائیوں میں انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے احتساب کے ججوں کو تو معمولی معمولی کمروں میں بٹھا رکھا ہے اسٹاف پورا نہیں ہے کسی کسی کے پاس تو اسٹیشنری بھی نہیں ہے جنرل صاحب اچھے مشیر ہی کامیابی دلواتے ہیں۔ اکیلا کپتان ٹیم کو نہیں جتوا سکتا۔ وقت سکڑ رہا ہے۔ سارے ہی تو سیاستداں کرپٹ نہیں ہے جلد از جلد اچھی شہرت رکھنے والوں کو اقتدار دے دیں اور خود مانیٹر کریں۔ ان کی غلطیوں کا ازالہ کریں اور درست سمت دکھائیں۔ قبل اس کے کہ دیر ہو کر قوم غلط قدم نہ اٹھالے کیونکہ آگے مزید اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اللہ خیر کرے۔

27th October, 2000

بیچارہ شہید

آج کے اخبار میں ہمارے ایک کالم نگار نے ہماری پولیس کے جاں بحق ہونے پر ''شہید لکھا جائے یا مارا جائے لکھا جائے'' پر کافی روشنی ڈالی مگر یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ مرنے والا شہید ہوا یا جاں بحق۔

آج ہی اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس میں ایس ایس پی میر پور خاص سے تین پولیس والوں نے دو سو روپے رشوت طلب کی کیونکہ ایس ایس پی صاحب سادہ کپڑوں میں ویگن سے دو بھینسیں لے جا رہے تھے۔ ایس ایس پی صاحب نے ان بیچارے تینوں پولیس والوں کو سسپینڈ (Suspend) کر کے علاقہ تھانہ انچارج کے حوالے کر دیا۔ یہ ایس ایس پی صاحب میرے خیال میں یا تو بالکل نئے ہوں گے یا بالکل ان چند ایماندار افسران میں سے ہوں گے جو رشوت کو گالی سمجھتے ہوں گے۔ مگر ایس ایس پی صاحب یہ بھول گئے کہ جس ایس ایچ او کے حوالے کیا ہوگا وہ عوام سے کتنی رشوت لیتا ہوگا۔ کیونکہ پولیس والا اپنی حیثیت کے مطابق صرف دو سو روپے وصول کرتا تھا جس میں تین حصہ دار تھے یعنی صرف 75 روپے فی پولیس کا حصہ ہوا جبکہ اگر ایس ایچ او اکیلا کوئی کیس پکڑتا ہے۔ وہ کم از کم پچیس ہزار سے لے کر ایک لاکھ روپے تک طلب کرتا ہے چاہے وہ بے گناہ ہو یا مجرم ہو، چاہے بیوہ کا زیور بکے یا غریب کی جان جائے۔ ان کو صرف اور صرف پہلے لال رنگ والے قائداعظم سے محبت ہوتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ پھر ہرے اور اب تو نیلے قائداعظم کی گڈی اچھی لگتی ہے۔ پہلے ٹریفک پولیس والا سڑک کے ساتھ لگے پان کے کیبن کی طرف اشارہ کر کے اس پان والے کے ہاں رشوت رکھواتا تھا پھر ٹوپی میں رکھنے لگا۔ مگر جب نوٹوں کی گرمی زیادہ بڑھی تو اب ڈائریکٹ جیب میں بھر لیتا ہے اس کو کسی کا ڈر نہیں رہا کیونکہ بقول اس کے کہ جناب اس میں میرے بڑے صاحب کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ ایک تھانے کے باہر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا ہے پولیس کا فرض دیانت، امانت، شرافت، جرأت، یقین

محکم وغیرہ وغیرہ کیونکہ آگے تھانے کی دیوار ختم ہورہی تھی ورنہ اردو کے تمام اچھے الفاظ اس دیوار پر سمٹ آتے۔ہم بڑے خوش ہوئے کہ چلو ایک تھانہ تو کم از کم پاک ہوا۔اسی خوشی میں ہم تھانے میں داخل ہوئے۔ انچارج صاحب نہیں تھے ہیڈ محرر سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ساتھ ایک پولیس والا جو ایک منی بس کے ڈرائیور سے مک مکا کر رہا تھا۔ان گنہگار کانوں نے سنا کہ جلدی کرو۔اگر انچارج آ گیا تو رقم دگنی ہوجائے گی۔ ہمارے ایک ایس ایس پی صاحب جو آج دنیا میں نہیں رہے۔ہمارے فارم پر اکثر آتے تھے۔رات کا کھانا کھا کر سو جاتے تھے اور پھر آخری پہر سرکاری گاڑی میں روانہ ہوجاتے تھے۔بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صبح چار اور پانچ بجے تھانے پر چھاپہ مارتے تھے اور جو تھانیدار تھانے پر نہیں ہوتا تھا اس سے وہ الگ حساب لیتے تھے۔جو مل جاتا اس کی درازیں اور جیبوں کی تلاشی لی جاتی۔وہ رقم جو رات بھر کی کمائی کی نکلتی وہ تو خیر ان کی ہوتی مگر ساتھ ساتھ دوسرے دن اپنے دفتر میں بلوا کر پورا حساب کتاب کیا جاتا اور تھانے کی اوسط آمدنی کا تخمینہ لگایا جاتا اور اس حساب سے بھتہ وصول کیا جاتا۔

اگر آپ اخبارات کا مشاہدہ کریں یہ پولیس وارداتیں ہر شہر گاؤں میں روزانہ ہوتی ہیں۔اب تو ہماری عدلیہ بھی ان پولیس والوں سے ناراض اور بیزار ہوچکی ہے مگر کچھ نہیں کرسکتی ہے ان کے آگے لاچار ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہورہا ہے ہماری پولیس اتنی کرپٹ کیوں ہوچکی ہے اور اس کو کسی نے آج تک سدھارنے کی کوشش بھی نہیں کی۔اس کا کون ذمہ دار ہے حتیٰ کہ اس کی کوئی وزارت بھی نہیں ہے اور کوئی اس کا وزیر بھی نہیں ہے ہر شریف آدمی کی اس سے جان جاتی ہے یہ کوئی گمبھیر غیر حل مسئلہ نہیں ہے۔بات صاف ہے سب سے پہلے تو اس کی تنخواہ اتنی ہے جتنی وہ اپنی سفید وردی ہی دھلوا سکتا ہے اور پاور اتنی کہ ہر سابق وزیر اعظم کی بیوی کی گاڑی کرین سے اٹھوا سکتا ہے اور جب وہی وزیر اعظم دوبارہ وزیر اعظم بن جاتا ہے تو اس وقت اس وزیر اعظم کے حکم سے دوسرے سابق وزیر اعظم کے باپ کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیتا ہے اس کے قلم میں اور کاغذ میں اتنا دم ہوتا ہے کہ بے گناہ کو پھانسی اور پھانسی والے کو آزاد کروا سکتا ہے ہماری پولیس میں تعلیم بھی واجبی سی ہوتی ہے تعلیم سے زیادہ اس کی توند کا ہونا ضروری ہے جو اس کے رعب کا لازمی حصہ ہے اس لئے اچھے پولیس والے کے لئے جتنی بڑی توند ہوگی اس کی رشوت کا اسکیل بھی اتنا ہی بڑا ہوگا۔اگر آپ کو اس ملک میں انصاف لانا ہے تو سب سے پہلے دس پولیس والوں کی تنخواہ کے برابر ایک پولیس والا پڑھا لکھا نوجوان

لائیے۔اس کی رہائش، بچوں کی تعلیم کا بندوبست، معاشرہ میں اعلیٰ مقام دلایا جائے جیسا کہ دوسرے ممالک میں پولیس کی تعداد کم سے کم اور تنخواہیں زیادہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔مجرم ان کے نام سے کانپتے ہیں۔ان سے وزیر اعظم، صدر وغیرہ کی حفاظت کے لئے دن دن بھر سڑکوں کے کنارے منہ کر کے نہیں کھڑا کیا جاتا۔ہزاروں پولیس والے صرف ایسی ہی خدمات کے لئے کیوں بھرتی کئے جاتے ہیں۔بھلا تین چار ہزار روپے میں کوئی قانون کی حفاظت کرسکتا ہے اور عوام کو تحفظ دے سکتا ہے۔

جیب سے موبائل میں پیٹرول بھروا سکتا ہے بڑے صاحب کی گوشت ترکاری کا بندوبست کرسکتا ہے بیگم صاحبہ کو شاپنگ کروا سکتا ہے، یہ کیوں کسی کو نظر نہیں آتا اور پھر ہر وقت مسلح مجرموں کے سامنے جن کے پاس جدید اسلحہ ہو اپنی جان داؤ پر بھی لگائے۔آپ اس کے مرنے پر زیادہ سے زیادہ ایک بچے کو نوکری دے دیں گے لاکھ پچاس ہزار روپے کا انعام دے کر دفنا دیں گے۔بقایا اس کی بیوہ، بہنیں، ماں باپ اور بچے کہاں جائیں گے اور اگر اس کی ڈیوٹی کا حساب لگائیں۔اٹھارہ سے بیس گھنٹے تو عام ہیں اور آج تک آپ نے ان کو اوور ٹائم دیا؟

تھانے دار گھر پر بھی بیچارہ وائرلیس سیٹ سمیت کمرے میں سوتا ہے۔اس کی بھی کوئی خواہش ہوتی ہوگی۔ اس کے بھی دوست احباب کے ہاں شادی بیاہ موت زندگی ہوتی ہوگی۔مگر وہ اپنی تقریب چھوڑ کر تھانے میں کوئی واقعہ ہوجائے تو فوراً جائے واردات پر پہنچتا ہے اگر نہ پہنچے تو یہی اخبارات شہ سرخی لگاتے ہیں کہ پولیس دیر سے آئی۔انصاف طلب کرنے والو، پہلے انصاف اس کے ساتھ کرو۔پھر انصاف کی توقع کرو۔میں نے پہلے بھی کئی بار لکھا ہے کہ پولیس کو ہم کرپٹ بناتے ہیں خود ایک پولیس والے نے مجھے بتایا کہ صاحب ایک لاکھ روپیہ دے کر میں نے اپنا تبادلہ ٹریفک میں کروایا ہے کیونکہ تھانے دار مجھ سے روز پیسوں کے لئے جھگڑتا تھا۔ جب ایک لاکھ روپیہ دے کر وہ سڑک پر آئے گا تو وہ رشوت نہیں لے گا تو اور کیا کرے گا۔لہٰذا معاشرے کو کرپشن سے نکالنے کے لئے سب سے پہلے انقلابی اقدامات اور قانون کی بالادستی کے لئے ایک ایماندار پولیس کا محکمہ ہی ضروری ہے جب تک ہم اس میں تبدیلی نہیں لاتے۔ہم کو پولیس سے شکوہ کرنے کا حق نہیں ہے میں تو اس کو بے چارہ شہید کہوں گا۔

03rd November, 2000

ایک کلوآ ٹا، ایک کلوواٹ بجلی ایک دام

آج کل پورے ملک میں بجلی کا بریک ڈاؤن اور بار بار لوڈ شیڈنگ نے عوام کی جان عذاب میں کی ہوئی ہے۔اب کے سال سردی کا موسم آنے کے باوجود دن میں کم از کم دو بار لوڈ شیڈنگ تو اعلانیہ طور پر ہوتی ہے اور ویسے بھی کئی کئی دن تک بعض علاقوں میں بجلی ہوتی ہی نہیں ہے۔لوگ چلا چلا کر ہلکان ہو چکے ہیں اور خود چیف ایگزیکٹو صاحب بھی اعلان کر چکے ہیں کہ لوڈ شیڈنگ بند کرو۔مگر مجال ہے کہ بجلی کے محکمہ پر اس دھمکی کا کوئی اثر ہو اخبارات لکھ لکھ کر تھک چکے ہیں کہ پچھلے سال تک تو صرف گرمیوں میں بجلی جاتی تھی مگر اس سال تو لگتا یہی ہے کہ پورے سال بریک ڈاؤن اور لوڈ شیڈنگ عوام کا مقدر بن چکا ہے۔اس پر سونے پہ سہاگہ یہ ہے کہ جب مہینے کے آخر میں بجلی کا بل آتا ہے تو اچھے اچھوں کو پسینہ آ جاتا ہے۔ذرا بجلی والوں کی چالاکیاں تو دیکھئے کس کس طرح عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔رہائشی مکان پر بجلی کے اصلی دام صرف ایک روپے پچاس فی یونٹ ہیں جبکہ کئی سال پہلے ایک روپے سرچارج فیول ایڈجسٹمنٹ کے نام پر لگا دیا گیا تھا۔مگر عوام پھر بھی خاموش رہے۔پھر چپکے چپکے خاموشی سے تین روپے پچاس پیسے ایڈیشنل سرچارج کے نام پر لگا دیئے گئے پھر اس پر بھی بس نہیں کیا مزید ایک روپیہ اس سرچارج پر سرچارج لگا دیا۔یعنی ڈیڑھ روپے والی بجلی گھریلو استعمال کے لئے سات روپے یونٹ تک پہنچ گئی۔اس پر یہ ستم کہ اگر وقت پر بجلی کا بل نہ بھرو تو دس فیصد لیٹ فیس اضافی بھرنی پڑتی ہے۔اگر آپ کا گھر بند ہے یا میٹر ریڈر نہیں آیا تو بل باقاعدگی سے آتا رہے گا اور پچھلے جتنے مہینے ریڈر نہیں آئے گا تو پچھلے بل کے مطابق ہی بل آتا رہے گا۔اگر گھر کا مکین بل نہ بھرے تو دوسرے مہینے بجلی کاٹ کر چلے جائیں گے دوبارہ بجلی کی لائن کھلوانے کے لئے چکر پہ چکر اور رشوت اضافی لگے گی۔اسی وجہ سے لوگ مجبور ہو کر بجلی والوں سے مک مکا کروا کر میٹر اور کنڈوں سے بجلی چرانے پر مجبور ہیں۔دوسری طرف انڈسٹریل

اور کمرشل کے بجلی کے نرخوں نے تو تباہی پھیلا رکھی ہے۔بجلی کے نرخ صرف دو روپے پچاس پیسے ہیں پھر اس کے ساتھ وہی چکر فیول ایڈجسٹمنٹ، ایڈیشنل سرچارج + سرچارج سب ملا کر بارہ روپے فی کلوواٹ بجلی پڑتی ہے۔یعنی چاہے آپ ایک کلو آٹا خریدیں یا ایک کلوواٹ بجلی خریدیں دام ایک ہیں۔کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ عوام پر ایک بوجھ پر دوسرا بوجھ کیوں ڈالا جا رہا ہے؟ اتنی مہنگی بجلی خرید کر ہم ایکسپورٹ کے میدان میں بھارت کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔نتیجہ یہ کہ بجلی کا بوجھ عوام پر ڈال کر صنعتکار دام بڑھانے پر مجبور ہے۔حکومت بجلی کو مہنگا کرتی ہے تو الزام دکانداروں اور صنعتکاروں پر لگ جاتا ہے۔پوری دنیا میں انڈسٹریاں لگانے کے لئے صنعتی ترقی کی خاطر بجلی کم سے کم داموں میں دی جاتی ہے کیونکہ اس سے لوگوں کا روزگار وابستہ ہوتا ہے۔برآمدات ہوتی ہیں دوسرے ممالک سے کمپیٹیشن ہوتا ہے، ہم مہنگے داموں میں دی جاتی ہے کیونکہ اس سے لوگوں کا روزگار وابستہ ہوتا ہے۔برآمدات ہوتی ہیں دوسرے ممالک سے کمپیٹیشن ہوتا ہے، ہم مہنگے داموں پر کس طرح برآمدات بڑھائیں گے؟ اس مہنگائی کی ذمہ داری بجلی، گیس، پیٹرول، ڈیزل اور امپورٹ ڈیوٹی پر ہے جو حکومت کی طرف سے بڑھائی جاتی ہے، اس سے جان چھوٹے تو پھر ہماری کرنسی کی روزمرہ کی Devaluation ہے جبکہ ڈالر 12 اکتوبر 1999ء میں 54 روپے تھا۔

حکومت کرپٹ تھی سیاستدان اور امراء مل کر بینکوں کو لوٹ رہے تھے تو آٹا =/8 روپے تھا اب ٹھیک ہے کہ فوجی حکومت پر کرپشن کا کوئی الزام نہیں ہے مگر آٹا =/12 روپے اور ڈالر =/62 روپے تک جا پہنچا ہے۔روزمرہ کی اشیاء حتیٰ کہ جو خود ہمارے ملک کی پیداوار ہیں۔دالیں =/20 روپے تھیں ایک سال میں =/30 روپے سے =/40 روپے تک جا پہنچی ہیں، چینی =/18 روپے سے =/28 روپے کیوں ہوگئی؟ بار بار اضافے اس حکومت میں بھی پچھلی حکومتوں کی طرح جاری ہیں۔ہم کس کے ایجنڈے پر عمل کر رہے ہیں۔آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک دونوں ہمیں پوری دنیا میں رسوا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔بار بار ہم کو ڈیفالٹر ہونے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور ہم ہیں کہ بھیک کا ٹوکرا لئے ان کے در پر بھکاریوں کی طرح ان کی ہر شرط مان کر قرض لے رہے ہیں۔وہ ہم کو معاشی طور پر ختم کرنا چاہتے ہیں، ہم کو ایٹمی دھماکہ کرنے کی سزا وہ دے کر رہیں گے، آج نہیں تو کل۔اس بھیک کا بھیانک انجام کبھی ہم نے سوچا؟ اسلام آباد کے صدر اور وزیراعظم کے محلات، کنونشن ہال، ایم این اے اور ایم پی اے کا ٹچ دیکھ کر کون کہے گا کہ ہم غریب ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔کروڑوں روپے

سے چلنے والے ان کے کچن کے اخراجات آج بھی جاری ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں پہلے وزراء مشیران کے استعمال میں تھیں آج کل سیکریٹریوں کے استعمال میں ہیں۔ وزراء پہلے سے چوتھائی ہو چکے ہیں کہاں ہیں ان کی گاڑیاں، ان پر خرچ ہونے والے اخراجات کیا کم ہو گئے ہیں؟ لوٹی ہوئی دولت کچھ ملی تو کہاں چلی گئی۔ عوام کو کوئی ریلیف ملا؟ کون عزت دار ہو گا جو فوڈ کوپن کے لئے پہلے لائن میں لگے گا پھر اس کوپن کے استعمال کے لئے دکان در دکان جائے گا۔ عوام پہلے سیاستدانوں کا گھیراؤ کرتے تھے، اسمبلیوں کے سامنے جلوس نکالتے تھے۔ حکمران بھی عوام کے غضب سے ڈرتے تھے مگر اب نہ اسمبلیاں ہیں، نہ سیاستدان، عوام کس کے در پر جا کر اس مہنگائی کا رونا روئیں۔ یہ بات یاد رکھیئے کہ عام آدمی کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کون ملک پر حاکم ہے۔ اس کی نظر صرف یہ ہوتی ہے کہ کون ہے جو اس کو ریلیف دے۔ زیادہ نہ صحیح، بقول شاعر کہ ۔

''اور کچھ بھی مجھے درکار نہیں ہے لیکن
میری چادر میرے پیروں کے برابر کردے''

08th November, 2000

کچھ تبصرے آپ کی خدمت میں

کچھ خطوط مجھے ملے۔ میرے قارئین نے شکوہ کیا کہ تم ہر وقت مسائل کا ذکر کر کے عوام کو رنجیدہ کرنے میں مصروف رہتے ہو۔ کبھی قوم کو ڈیفالٹر ہونے سے ڈراتے ہو۔ کبھی ملک کے وسائل کی کمی کا رونا روتے ہو۔ خدارا کبھی قوم کو کوئی خوشخبری نہیں سنا سکتے تو کم از کم کوئی کالم تو ایسا لکھ دو کہ اس دن پڑھنے والا پڑھ کر ہنس دے۔ اس لئے میں نے ہفتے بھر کے اخبارات جمع کئے اور اس میں سے چند خبروں پر اپنا تبصرہ لکھا ہے امید ہے کہ قارئین مطمئن ہو جائیں گے۔ (خ ان)

☆ قومی اداروں کی فروخت میں لوٹ مار کی اجازت نہیں دیں گے۔ (نواز شریف)

اللہ اللہ کیا زمانہ آ گیا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ پہلے اپنے خلاف دائر ریفرنس کو تو بھگتا لو۔

☆ میں نے وزیراعظم بنے کے لئے نہیں بلکہ عوام کی بھلائی کے لئے چیف ایگزیکٹو کو مشورے دیئے ہیں۔ (معین قریشی)

اے امپورٹڈ وزیراعظم، اسی کو تو کہتے ہیں کہ انگور کھٹے ہیں۔

☆ پاکستان اسٹیل مل کے شعبہ میڈیکل میں گھپلوں کا انکشاف۔ ایک انجکشن تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ (انکوائری کمیٹی)

باقی اسٹیل مل کتنے حصوں میں تقسیم ہوا اس کا کون انکشاف کرے گا کہ اسٹیل مل کی مونوپولی کے باوجود آج تک اسٹیل مل خسارے میں کیوں ہے۔

☆ اب سماجی خدمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ (ایک معروف و مصروف اداکارہ کا اعلان)

پہلے آپ کے کیا کر رہی تھیں وہ بھی وضاحت کر دیں۔

☆ دنیائے کفر مسلمانوں کو مٹانے کے لئے متحد ہوگئی ہے۔(عثمان کینیڈی)

بڑے بھائی پہلے اپنے نام سے کفر کی نشانی ''کینیڈی'' تو ہٹا دیتے۔

☆ اپنے عہدے سے مستعفی نہیں ہوا ہوں۔(گورنر سندھ)

کچھ دن پہلے برخوردار جاوید جبار نے بھی یہی اعلان کیا تھا۔

☆ تھانوں کے لاک اپ میں چھاپے مارے جائیں گے۔(ڈی۔آئی۔جی سندھ)

اس سے ایک فائدہ ہوجائے گا کہ پولیس جلدی مک مکا کرلے گی۔عوام کی طرف سے شکریہ وصول کیجئے۔

☆ سلیم ملک، آصف اقبال، اجے جڈیجہ، برائن لارا، اسٹیورٹ، وسیم اکرم سب میچ فکسنگ میں ملوث رہے ہیں۔(سی بی آئی رپورٹ)

☆ بیچارہ ہنسی کرو نیئے سچ بولنے پر اور اظہر الدین مسلمان ہونے کی وجہ سے پھنس گئے۔باقی سب آج بھی کھیل رہے ہیں۔

☆ ملک میں صرف خلفائے راشدین کے نظام کو نافذ کرنے سے ملک سدھر جائے گا۔(ایک عالم دین)

تو پھر پولیس کا محکمہ کون سنبھالے گا۔

☆ تین ہفتوں کی مندی کے بعد اسٹاک مارکیٹ میں زبردست تیزی آگئی۔(کامرس رپورٹ)

کیا پھر غیر ملکی جواری اسٹاک خریدنے آگئے۔مشتری ہوشیار باش۔

☆ کوہ نور ہیرا انگلستان اور افغانستان کو واپس کرے۔(طالبان)

اگر جواب میں انہوں نے اسامہ بن لادن کو مانگ لیا تو؟

☆ کراچی کے نیشنل اسٹیڈیم میں تماشائیوں کی گنجائش 35 ہزار سے بڑھا کر 90 ہزار کردی جائے گی۔(توقیر ضیاء)

گویا گیٹ منی کے بجائے بلیک منی میں اضافے کا پروگرام ہے۔اب آپ کے رشتہ دار اور الائیڈ بینک والے دل کی گہرائیوں سے دعا دیں گے۔

☆ بھارت کے خلاف اپنے ہی شہروں میں بم دھماکوں کے ثبوت مل گئے۔(حکومت پاکستان کا دعویٰ)

پاکستان میں تو ہم بم دھماکوں کے ثبوت حاصل نہیں کرسکے، سرحد پار کے ثبوت کہاں سے ملے۔

☆ 10 دن میں 20 پونڈ وزن کم کریں اور اسمارٹ بن جائیں۔(ایک اشتہار)

اگر یہ سچ ہوتا تو اس سلمنگ سینٹر کے سامنے عورتوں پر پولیس کے لاٹھی چارج کرنے کا الزام لگ چکا ہوتا۔

☆ عوام بکرے کے گوشت کے بجائے زندہ بکرا یا نقد جمع کرائیں کیونکہ گوشت خراب ہوجاتا ہے۔(ایک فلاحی ادارے کی اپیل)

زندہ بکرا تو بار بار بک جاتا ہے جبکہ گوشت صرف ایک بار بکتا ہے۔

☆ سندھ کابینہ نے ٹرانسپورٹرز کے اصرار پر کرایوں میں اضافہ کردیا۔(سندھ کابینہ کا فیصلہ)

شکر ہے خدا کا سندھ کابینہ نے کچھ کام تو کیا۔عوام کی طرف سے مبارکباد قبول کریں۔

☆ مسلم لیگ پیپلز پارٹی کے ساتھ بیٹھ جائے گی تو قیامت نہیں آجائے گی۔(راجہ ظفر الحق)

اگر اقتدار میں ساتھ بیٹھ جاتی تو کون سی قیامت آجاتی۔

☆ بے نظیر جمہوریت سے مخلص نہیں سودے بازی کے لئے چالیں چل رہی ہیں۔(اعجاز الحق)

اے ضیاء الحق کے بیٹے کبھی تو چپ بھی رہا کرو۔

☆ 2600 سال پرانی ممی کی دریافت۔(خبر)

گھر کی ممی کی کسی کو فکر نہیں ہے۔

☆ طلسماتی انگوٹھی خریدیئے اور تمام فکروں سے آزاد ہوجایئے۔(اشتہار)

اگر واقعی یہ فکروں سے آزاد کرسکتی تو اشتہار دینے کی کیوں ضرورت پیش آتی۔کون کہتا ہے کہ صرف سیاستداں قوم کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔

☆ قوم جلد نواز شریف کو رہا کروالے گی۔(بیگم کلثوم نواز)

یہ غلطی قوم دوبارہ نہیں کرسکتی۔

☆ 48 سالہ کیریئر میں سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ عارف عباسی کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوگیا۔(بریگیڈیئر (ر) عاطف)

حقیقت یہ ہے کہ کھلاڑی اور پی آئی اے کے ملازمین آج بھی عارف عباسی کو یاد رکھتے ہیں جبکہ خود

بریگیڈیئر صاحب کے بچوں نے ہاکی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

☆ صارفین ٹیلی فون کی شکایتوں میں کمی واقع ہوئی ہے۔(ابوشمیم عارف کی پریس بریفنگ)

اس بات کا تو میں بھی گواہ ہوں۔ایک شام میں نے شکایت درج کرانے کے لیے 18 ملایا رات گئے تک ملاتا رہا۔مگر کسی نے فون ہی ریسیو(Receive) نہیں کیا۔کم از کم ایک میری شکایت تو کم ہوئی نا۔

☆ غربت مکاؤ اسکیم کی رقم 2.3 ارب سے بڑھا کر 8 ارب روپے کردی گئی۔(سرکاری اعلان)

گویا 14 کروڑ عوام کے حصے میں اب 16 روپے 15 پیسے آئیں گے۔جس میں ایک کلو پیاز بھی نہیں ملے گی۔

☆ پیاز کی نئی فصل کی آمد سے قیمتوں میں زبردست کمی اب پیاز 20 روپے کے بجائے 16 روپے میں ملے گی۔(حکومت کا دعویٰ)

کہاں سے آمد؟ گوداموں سے یا درآمد سے جبکہ عام حالات میں پیاز 5 روپے سے دس روپے تک ملتی تھی۔

☆ پولیس کو دہشت گردوں کی گرفتاریوں کے لئے فری ہینڈ دے دیا گیا۔(آئی جی پولیس سندھ)

پہلے کیا وہ گرفتاریوں کے سلسلہ میں عدالتوں سے اجازت لیتے تھے۔

☆ مجھے لاہور کی زبردست اور دن رات کی ترقی جس میں کشادہ سڑکیں، پلوں کی تعمیر پر شہباز شریف کو خراج تحسین پیش کرنے کا دل چاہتا ہے۔(ایک کالم نگار کی رائے)

کیا اس ترقی کے لئے شہباز شریف صاحب نے اتفاق فاؤنڈیشن کا سرمایہ لگایا تھا۔بھیا اس سے بڑا کام تو ان کے بڑے بھائی نے موٹروے بنا کر انجام دیا تھا جس کا کمیشن کھانے پر آج کل نیب میں ریفرنس کیس درج ہے کیا تم چھوٹے بھائی کا ریفرنس تیار کروانا چاہتے ہو۔

☆ بےنظیر اور زرداری نے ایک کھرب 44 ارب روپے لوٹے۔(فاروق لغاری)

☆ فاروق لغاری نے 100 ٹرکوں میں ایوان صدر کا سامان لیا۔40 کروڑ روپے خورد برد کئے۔140 ہزار ایکڑ زمین بلوچستان حکومت سے واپس لی۔(پیپلز پارٹی)

اے نادانو! گھر کی بات باہر نہیں کرتے۔

17th November, 2000

یہ ہفتہ کیسا رہے گا؟

تمام اخبارات رسالوں میں ایک صفحہ ہمیشہ میری نظر سے گزرتا تھا جس کا عنوان ہوتا ہے کہ ''یہ ہفتہ کیسا رہے گا'' میں نے تمام عمر اس صفحہ کو دیکھا ضرور تھا مگر کبھی بھی پورا نہیں پڑھا تھا۔پچھلے دنوں ایک پیر صاحب جن کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا جو اپنی پیشینگوئیوں کی وجہ سے کافی مشہور تھے جس میں محترمہ بےنظیر کو وزیراعظم بننے کی پیشینگوئی کی تھی۔اچانک کسی نے ان کو قتل کر دیا اور آج تک اس قاتل کا پتہ نہیں چل سکا۔مجھے یہ خبر پڑھ کر بڑا تعجب ہوا کہ دنیا بھر کو پیشینگوئی کرنے والے بےچارے کو خود اپنے مستقبل کا انجام معلوم نہیں۔بہرحال بطور مطالعہ میں نے کئی ماہ سے مختلف اخبارات اور رسالوں کی مدد سے جس میں آنے والے مستقبل کے متعلق پیشینگوئیاں، خطرات، خوشیاں وغیرہ درج ہوتی تھیں پڑھ کر جمع کیں اور تجزیہ کیا تو بڑے بڑے عجیب انکشافات ہوئے۔

میں یہ سوچتا تھا کہ یہ صفحہ کون پڑھتا ہوگا۔مگر جب میں نے اپنے دوستوں سے معلومات جمع کیں تو معلوم ہوا کہ ہماری خواتین اس میں مردوں کے مقابلے میں بہت آگے تھیں۔اکثر تو اخبارات اور رسالوں کے دیگر مضامین حتیٰ کہ خبریں بھی بعد میں پڑھتی ہیں۔پہلے وہ اس صفحہ کو تلاش کر کے نہ صرف پڑھتی ہیں۔اپنے ایک ایک بچے اور خود اپنے اور شوہر کے بارے میں پڑھ کر اس پر عمل درآمد بھی کرواتی ہیں۔مثلاً ایک دوست نے بتایا کہ میرے ستارے کے بارے میں اس ہفتے کے اخبار میں لکھا تھا کہ اس ہفتے سفر نہ کریں ورنہ زبردست نقصانات کا اندیشہ ہے جبکہ وہ ایک کاروبار کے سلسلے میں باہر جانے کی تمام تیاری مکمل کر چکے تھے۔عین وقت پر بیوی صاحبہ نے آ کر حکم دیا تمنے پڑھا کہ یہ ہفتہ سفر کے لئے منحوس ہے لہٰذا بھول جاؤ سفر کو۔شوہر چونکہ بیگم سے ڈرتے بھی تھے حکم نہیں ٹالا۔عین وقت پر فلائیٹ کینسل(Cancel) کروائی تو ایئر لائن والوں نے 50

فیصد کینسل کروائی چارج کرلی۔ پہلا یہ نقصان ہوا۔ پھر ایک ہفتے بعد اس پارٹی کو فون کیا تو اس نے بتایا چونکہ آپ وقت پر تشریف نہ لائے۔ لہٰذا یہ ٹینڈر دوسری پارٹی کو دے دیا جس کی وجہ سے یہ کاروبار بھی گیا اور لاکھوں کا نقصان الگ ہوا اور یہ مال جو وہ فروخت کرنا چاہتے تھے ان کے پاس تیار رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے رقم الگ پھنس گئی۔ انہوں نے لاکھ بیگم کو دلائل دیئے کہ بیگم اگر ہم سفر کر لیتے تو ہم نقصانات سے بچ جاتے۔ ہمارا کینسلیشن (Cancellation) چارج نہ جاتا۔ ہمارا ٹینڈر مل جاتا اور مال بھی فروخت ہو جاتا گویا نہ جانا نقصان کا باعث بنا۔ یقیناً یہ ہمارے کسی دشمن کی چال ہوگی۔ جو اس نے اخبارات کے یہ ''ہفتہ'' کالم میں چھپوا کر ہمیں رکوا دیا۔ مگر ان کی بیگم ان تمام دلائل سے مطمئن نہیں ہیں۔ کہتی ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہاری جان کو خطرہ ہو جاتا۔ ہم نے پھر کہا کہ جس فلائیٹ سے ہم جا رہے تھے وہ صحیح ٹائم سے گئی اور جس فلائیٹ سے ہماری واپسی تھی وہ بھی اپنے شیڈول کے مطابق آ گئی۔ جس شہر میں ہمیں جانا تھا۔ وہاں ایسا کوئی بڑا حادثہ بھی نہیں ہوا۔ مگر بیگم پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئیں اور آج بھی نہ صرف ''یہ ہفتہ کیسا رہے گا'' کا کالم پڑھنے کا سلسلہ جاری ہے بلکہ اس پر عمل درآمد بھی اسی طرح ہو رہا ہے۔

اسی طرح ہمارے پچھلے ہفتے ایک دوست دفتر میں تشریف لائے۔ ہمنے ان سے بھی پوچھا۔ بتاؤ تمہارا ستارہ کونسا ہے۔ انہوں نے اپنا ستارہ تو نہیں بتایا تاریخ پیدائش بتا دے کیونکہ ان کو بھی اس سے کوئی لگاؤ نظر نہیں آتا تھا۔ ہم نے جھٹ اخبار سے ان کی پیدائش کے مطابق ستارہ تلاش کر کے بتایا کہ اس ہفتے آپ کوئی نیا کاروبار نہ کریں اور کوئی نیا دوست بھی نہ بنائیں کیونکہ دوست آپ کو دھوکہ دے گا اور نئے کاروبار کے لئے یہ ہفتہ مناسب نہیں ہے۔ یہ آپ کے ستارے بتا رہے ہیں وہ یہ سن کر پریشان ہوگئے۔ کہنے لگے ابھی تین دن پہلے ہی ایک صاحب نے مجھے ایک نئے دوست سے ملوایا اور میں نے ان ہی نئے دوست کی معرفت چینی کا بہت بڑا سودا بھی کرلیا ہے۔ اب کیا کروں۔ وہ دوست پنجاب چلا گیا ہے میں اسے کہاں تلاش کروں میں نے کہا۔ بھائی اب صبر کرو اور نقصانات اور دھوکہ دہی کا انتظار کرو۔ خیر جب ہفتہ گزر گیا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے فون ملایا تو پہلی ہی گھنٹی پر ان صاحب نے فون اٹھایا اور چونکہ CLI سے نمبر آ گیا تھا۔ بغیر تمہید کے وہ کہنے لگے۔ میں بھی تمہیں صبح ہی صبح فون کرنے والا تھا۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ وہی ہوا ہوگا جو ان کے ستارے کے بارے میں لکھا تھا۔ مگر ہمیں بڑا تعجب ہوا جب انہوں نے بتایا کہ اس نئے دوست نے چینی کے نرخوں میں زبردست

اضافے کے باوجود اپنے وعدے کے مطابق پورا مال وقت سے ایک دن پہلے ہی دے دیا۔ جس سے لاکھوں روپوں کا تو فوری فائدہ ہوگیا اور بازار میں زبردست تیزی ہے۔ مال کی زبردست ڈیمانڈ بھی ہے ساتھ ہی انہوں نے شکایتاً کہا کہ اگر میں تمہارے مشورہ پر عمل کر لیتا اور سودا کینسل کر دیتا تو تم میرے پرانے دوست ہو۔ مجھے کتنا نقصان ہوتا جو بیعانہ دیا تھا وہ بھی جاتا اور تمہاری دوستی بھی جاتی۔ لہٰذا آپ ان ستاروں پر لکھے ہوئے حالات نہ بتایا کریں کیونکہ اگر کسی کو فائدہ ہوگیا وہ تو آپ کو کچھ نہیں دے گا البتہ اگر اس کو نقصان ہوگیا تو وہ آپ کے گلے پڑ جائے گا۔ مگر میں نے بھی آخری بار ایک اور دوست کو فون کیا یہ سمجھ کر کہ دونوں مرتبہ ہوسکتا ہے۔ اتفاقاً الٹے ستارے ہوگئے ہوں۔ دوست گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بیگم سے پوچھا۔ بھابھی کیا حال چال ہیں۔ بڑے دکھی لہجے میں بولیں بھائی ہم تو وقت کے ہاتھوں لٹ گئے۔ ہوا یہ کہ پچھلے اتوار کو ہم بڑے خوش تھے کہ میاں اخبار اٹھالائے اور ''یہ ہفتہ کیسا رہے گا'' کا کالم مجھے خود پڑھوایا جس میں ہمارے دونوں کے ستارے چونکہ ایک ہیں لکھا تھا انعامی اسکیم میں زبردست کامیابی کا امکان ہے اور موافق ہندسہ 4 ہے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جو رقم محفوظ کر رکھی تھی۔ 4 نمبر گھوڑے پر لگا آئے۔ وہ گھوڑا ہار گیا۔ راستے میں گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ اب ہسپتال میں پڑے ہیں۔ آپریشن بھی ہوا۔ ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اب ہسپتال کے بل کے لئے زیور بیچنے پڑیں گے۔ ہم نے کہا اچھا ہمیں معلوم نہیں تھا۔ شام ہسپتال آ کر عیادت کروں گا۔ یہ کہہ کر فون بند کر دیا ور پھر سوچنے لگا واقعی ستارے پیدائش پر اثر انداز ہوسکتے ہیں اور یہ لکھے ہوئے اشارے کہیں تک بندی تو نہیں ہوتی جو کسی کی پوری ہو جاتی ہو اور کسی کے ساتھ مذاق ہوتا ہو۔

پھر میں نے اپنی ہی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ ستارے اور پیدائش کا اسلام میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ محض تک بندی ہوتی ہے۔ ایک ستارے میں پیدا ہونے والا غریب بھی ہوتا ہے اور اسی تاریخ کو پیدا ہونے والا امیر بھی ہوسکتا ہے اور ایک دن پیدا ہونے والا مختلف ذہن رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ اتفاق سے ہم بھائی جڑواں ہیں۔ ہمارے شعبے الگ الگ ہیں۔ ہماری سوچیں بھی کافی مختلف ہیں اور ہماری شکلیں بھی جدا ہیں۔ تو بھلا چند لمحوں کے فرق سے ہمارے درمیان اتنا بڑا فرق ہوسکتا ہے تو 24 گھنٹوں میں نہ جانے کتنے بڑے فرق پڑ سکتے ہیں۔ مجھے یاد آیا۔ ایک مرتبہ میں ہانگ کانگ میں تھا۔ میرے ایک چینی دوست نے یونہی باتوں باتوں میں بتایا کہ یہاں سے دور ایک پہاڑی پر ایک چینی بوڑھا فال کے ذریعے پیشینگوئیاں کرتا ہے اور اس کے اردگرد جھمگھٹا لگا رہتا ہے

اس کے اصرار پر چلا گیا۔ اس نے دو سکے مجھے دیئے کہ اس کو تین مرتبہ ایک کاغذ پر کچھ چینی حروف لکھے تھے گراؤ۔ میں نے تین دفعہ وہ سکے الگ الگ طریقے سے گرائے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ سوالات کرو۔ مجھے چینی زبان نہیں آتی تھی۔ اس بوڑھے کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ ہمارے دوست نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے کچھ باتیں اس نے ماضی کی صحیح بھی بتائیں۔ مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے آخری سوال یہ کیا کہ میں کب تک سفر پر جا سکتا ہوں۔ اس نے حساب لگا کر بتایا میرے ستارے بتاتے ہیں کہ ایک سال تک کوئی سفر نہیں ہے۔ میرا دوست جواب سن کر سٹپٹا گیا۔ اس نے دوبارہ چینی زبان میں اس سے یہی سوال دہرایا۔ اس نے پھر حساب لگا کر وہی جواب دیا کہ ایک سال تک اپنے دوست کو بتا دو کوئی سفر نہیں ہے۔

اس دوست نے بڑی ہچکچاہٹ کے بعد مجھے جواب دیا کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ تم ایک سال تک سفر نہیں کر سکتے جبکہ خود میرے علم میں تھا کہ میں دو روز قبل ہی پاکستان سے آیا تھا اور اگلی صبح مجھے جاپان کا ٹکٹ اسی دوست نے کنفرم کروا کر دیا تھا اور دوسرے دن اسی پرواز سے میں جاپان چلا گیا۔ ایئرپورٹ پر وہی دوست مجھے چھوڑنے بھی آیا تھا اور کافی شرمندہ بھی تھا کیونکہ چینیوں کا اس ستاروں کے علم پر بہت بھروسہ ہوتا ہے یا یوں سمجھئے وہ ستاروں کے بغیر کوئی بھی نیا کاروبار، نوکری بڑے بڑے سودے کرنے سے پہلے ستاروں کی گردش کا احوال ضرور نکلواتے ہیں۔ چپہ چپہ میں پرانے حکیم اور جوتشی چینی سلطنت کا لازمی جز ہیں۔

چلتے چلتے ایک آخری بات اور بتا دوں۔ میں نے جب مختلف اخبارات سے یہ صفحات جمع کئے تو ایک اخبار میں لکھا تھا کہ فلاں ستارے کی رو سے سفر منع تھا۔ جبکہ دوسرے اخبار کا کالم اس سے بالکل مختلف رائے دے رہا تھا۔ یعنی اس میں واضح لکھا تھا کہ اس ہفتے سفر نیک شگون ہے کسی کسی کی رائے ایک بھی پائی گئی سب سے کامن (Common) بات جو میں نے محسوس کی وہ لفظ اندیشہ کا استعمال زیادہ ہے وہ تو وہی بات ہوئی۔ پرانے زمانے میں پیدائش سے قبل بادشاہ بڑے بڑے جوتشی بلواتے تھے اور ان سے آنے والے کا مستقبل اور لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ اس بارے میں بادشاہ سلامت کو لڑکے کی خوشخبری اور ملکہ عالیہ کو علیحدگی میں لڑکی کا اندیشہ سنا کر رخصت ہوتے تھے۔ اگر لڑکا نہیں پیدا ہوتا تھا تو وہ ملکہ عالیہ کو گواہ کے طور پر پیش کر دیتے تھے کہ آپ کے خوف سے ہم نے ملکہ کو آگاہ کر دیا تھا اور اگر لڑکا ہوتا تو بادشاہ اس جوتشی کو سچ ایڈوانس جاننے پر انعام اور اکرام سے نوازتے تھے۔ اب اللہ ہی جانے کون بشر ہے اور ہمارے ہفتے کیسے گزریں گے۔ یہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

23rd November, 2000

ہاتھوں سے گنتی اور ہم خیال گروپ

ایک امریکی عدالت سے تین افراد کو سزائے موت سنائی گئی۔ ان میں ایک امریکن، دوسرا برطانوی اور تیسرا ہندوستانی سردار جی تھا۔ جب ان کو آٹومیٹک کرنٹ والی بجلی کی کرسی پر بٹھانے کے لئے لایا گیا تو سب سے پہلے اس پر برطانوی شہری کو بٹھا کر جب سوئچ دبایا گیا تو کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ برطانوی شہری کے وکیل نے کہا کہ چونکہ ان کا موکل بے قصور تھا۔ اس وجہ سے یہ موت کی کرسی کام نہیں کر سکی۔ لہٰذا اس کو رہا کیا جائے۔ چنانچہ اس برطانوی شہری کو رہا کر دیا گیا۔ پھر امریکن کو لایا گیا۔ اس کو بھی کرسی پر بٹھایا۔ اسی طرح بٹن دبایا۔ کرسی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ امریکن کے وکیل نے بھی یہی کہا اور اس کے موکل کو بھی چھوڑ دیا گیا۔ آخر میں سردار جی کو جب اس آٹومیٹک کرسی پر بٹھایا گیا تو انہوں نے بیٹھ کر بیساختہ ہنسنا شروع کر دیا۔ جلاد نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو سردار جی نے بڑے رعب سے کہا پاگلو پہلے اس کرسی کا پلگ تو لگا لو وہ تو باہر نکلا ہوا ہے۔ بٹن کیا خاک کام کرے گا۔ بالکل اسی طرح آج کل امریکی صدارت کا معاملہ ہوا ہے۔ جب سے امریکن یہودی نائب صدارت کا امیدوار بنا ہے۔ پوری امریکن قوم کا پلگ باہر نکلا ہوا ہے اور سب بٹن دبا کر فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کبھی ان کی عدالت کہتی ہے کہ ہاتھ سے گنتی کی جائے اور کبھی مشینی گنتی کو نہیں مانتی۔ یار لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ الیکشن میں دھاندلی کرانے کا طریقہ کسی پاکستانی کی کارستانی لگتا ہے کیونکہ ہاتھ سے گنتی کروا کر آپ کسی کو بھی جتوا سکتے ہیں جو خاص طور پر ہمارے ملک میں ماضی کے الیکشنوں سے ثابت ہوتا چلا آ رہا ہے جو بھی ہارتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ الیکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے جب ایوب خان اور فاطمہ جناح کے الیکشن کے نتائج آنا شروع ہوئے تھے تو الیکشن پانچ بجے ختم ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے جو نتائج چھ بجے آنا شروع ہوئے وہ اس وقت کے مشرقی پاکستان کے پسماندہ علاقوں سے آنے شروع ہوئے۔

جہاں ٹیلی فون کی بھی سہولت میسر نہ تھی۔ اور ان تمام علاقوں سے ایوب خان کی جیت کا اعلان ہو رہا تھا جبکہ رات بارہ بجے تک کراچی، لاہور، پشاور جیسے بڑے بڑے شہر جہاں ہر چیز کی سہولت تھی وہاں گنتی جاری تھی مگر امریکن اس دھاندلی میں بھی پاکستان سے پیچھے رہ گئے۔ کیونکہ ہمارے ہاں ہاتھ سے گنتی 12 گھنٹوں میں ہو جاتی ہے ان مشینوں نے ان کو ناکارہ بنا دیا ہے وہ خود اپنی گنتی بھول گئے۔ اور تین ہفتے ہونے کو آ رہے ہیں صرف تین کاؤنٹیز کے ووٹ ہاتھ سے نہیں گنے جا سکے حتیٰ کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو بھی غیر منصفانہ قرار دے دیا گیا ہے کہ اس نے ہاتھ سے گنتی کی کیوں اجازت دی ہے۔ کم از کم ہمارے ملک میں سپریم کورٹ الیکشن میں غیر جانبدار رہی ہے اور آج تک اس پر کوئی الزام نہیں لگا جبکہ پہلی ہی دھاندلی میں ان کی عدلیہ اپنی غیر جانبداری برقرار نہیں رکھ سکی اور یہودی لابی پھر کامیاب ہوگئی۔ اب معاملہ وفاقی سپریم کورٹ تک جا پہنچا ہے اگر وفاقی سپریم کورٹ نے پورے ریاست ہائے امریکہ کے نتائج کو ہاتھ کی گنتی سے موخر کر دیا تو شاید دو سال میں بھی ان ہزاروں کاؤنٹیز کے ووٹ نہیں گنے جا سکیں گے اور جب تک ووٹ نہیں گنے جاتے، نئے صدر کا اعلان نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی طرح ہو بھی جائے تو دونوں فریقین ایک دوسرے پر دھاندلی کا الزام لگا چکے ہیں۔ اس طرح جو بھی صدر بنے گا وہ متنازع ہوگا اور امریکہ کی تاریخ میں یہ پہلا متنازعہ صدر بھی یہودی سازش کا نتیجہ بنے اس سے امریکہ کی پوری دنیا میں جتنی رسوائی ہوئی ہے اگلے سو سال تک بھی وہ اب کسی ملک میں دھاندلی کا الزام نہیں لگا سکے گا۔ جو اس کا وتیرہ تھا کہ صرف پسماندہ ممالک میں ہی دھاندلی ہو سکتی ہے۔ آخر قدرت نے انکل سام کو بھی لگام لگا دی ہے۔ اگر یہ پنڈورا بکس کھلا تو دنیا دیکھے گی کہ پہلے کیسی کیسی ٹیکنیکل دھاندلیاں ہوتی رہی ہوں گی۔ بقول شاعر

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

دوسری آج کی اہم خبر مسلم لیگ کی جی ڈی اے میں شمولیت کی باقاعدہ درخواست سے مسلم لیگ میں ایک دھڑے کا اور اضافہ ہو گیا۔ کیا پہلے ہی مسلم لیگ میں کم دھڑے تھے۔ اگر گینز بک کا ریکارڈ چیک کیا جائے تو مسلم لیگ پہلے ہی دھڑوں میں ریکارڈ توڑ چکی ہے۔

آج تک تو دھڑوں کا تعلق کسی نہ کسی شخصیت سے ہوتا تھا مگر (ہم خیال) گروپ کی تشکیل سے خود مسلم

لیگ کی نفی ہو جاتی ہے۔ گویا پہلے مسلم لیگی ہم خیال نہیں تھے تو پھر مسلم لیگ میں کیوں آئے تھے۔ یا پھر بقایا یعنی نواز شریف گروپ ہم خیال نہیں ہے تو پھر نواز شریف کے معاملے میں کیا ہے۔ خوبصورت بات یہ ہے کہ دونوں گروپ ایک دوسرے کو جماعت سے خارج کر رہے ہیں اور دونوں کی اصلی دائی بتا رہے ہیں جبکہ نئے گروپ کا کہنا ہے کہ محترمہ کلثوم تو مسلم لیگ کی باضابطہ رکن بھی نہیں ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو کیا آج تک مسلم لیگ نے قائداعظم اور قائد ملت کے بعد کوئی باضابطہ کام کیا ہے۔ وہ تو بے چاری بیوگی کے پچاس سال پورے کرنے والی ہے جب جس نے چاہا۔ اپنے سے منسوب کر لیا۔ ''مگر اقتدار شرط ہے'' ہر دور میں امرت دھارا ثابت ہوتی ہے اور آج بھی اقتدار کی کشمکش ہے جو نیا نام ہم خیال وجود میں آیا ہے۔ اگر آج چیف ایگزیکٹو الیکشن کرانے کا اعلان کر دیں تو جی ڈی اے جس میں مسلم لیگ اور پی پی پی دونوں شامل ہیں۔ عوام کس کو ووٹ دیں گے اور اقتدار کس کو منتقل ہوگا۔ دونوں کے نظریات مختلف ہیں۔ کارکنوں کی سوچ اور فکر ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

پی پی پی کے کارکن گیارہ سال تک مار کھانے کے باوجود الگ نہیں ہوئے مسلم لیگ ایک سال میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ ذرا اوپر سے اشارہ ہو جائے ہم خیال میں بھی ہم الگ اور خیال الگ ہو جائیں گے۔ اعجاز الحق تو کب کے سولو پرواز کے لئے شیروانی اور سوٹ دونوں ہی سلوا چکے ہیں۔ ادھر چوہدری برادران نواز شریف کی ناانصافیوں کی داستان دل میں دبائے بیٹھے ہیں تو دوسری طرف عابدہ حسین بجلی کی چوری کا دکھ بھولنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

میاں محمود قصوری کے فرزند خورشید قصوری صاحب نے تو نواز شریف دور میں ہی جمہوریت کی خاطر حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کر کے گروپ بندی کی ابتداء کر دی تھی تو دوسری طرف میاں اظہر لاہور میں روٹھ کر اپنے کارکن اکٹھے کرنے میں لگ گئے تھے۔ تو اس ہم خیال گروپ کا صدر کون ہوگا۔ جنرل سیکریٹری کون ہوگا۔ اس کی لائن آف ایکشن کیا ہوگی۔ اس میں تو ہر شخص لیڈر رہے۔ وہ کیسے دوسرے کے انڈر کام کرے گا۔ عہدوں ہی کی تقسیم میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ ابھی تو صرف اسلام آباد کے دفتر ہی پر قبضہ ہوا ہے جو جس کے ہاتھ لگے گا وہ اٹھا کر لے جائے گا۔ پہلے کرسیاں چلیں گی پھر کرسیاں بھی غائب کر دی جائیں گی پھر ایک ایک کر کے سارا سامان غائب ہوگا۔ پھر ان کمروں کا نام مسلم لیگ ہو جائے گا اور پھر جو گروپ تگڑا ہوگا اس دن اس کا قبضہ ہوگا۔

محمود غزنوی کی طرح موسم اور حالات کے مطابق دفتر پر حملے جاری رہیں گے۔ کبھی مسلم لیگ (ن) کا جھنڈا لٹکایا جائے گا تو کبھی ہم خیال کا جھنڈا جلایا جائے گا۔ ابھی تو یہ بھی فیصلہ نہیں ہوا کہ جھنڈے کا اصلی حقدار کون ہوگا۔ پارٹی کی نمائندگی کون کرے گا۔ یقیناً ہم خیال گروپ میں انتشار ہی انتشار ہوگا جبکہ دوسری طرف وہ لوگ جنہوں نے پی پی پی کے خلاف مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے وہ اب مسلم لیگ کی جی ڈی اے میں شمولیت سے خوش نہیں ہو سکتے۔ ان کو اپنے ووٹ ضائع ہونے کا افسوس رہے گا۔ گویا کہ مسلم لیگ کا ووٹ بینک بھی بری طرح متاثر ہوگا۔ عوام کی سوچ کا کسی کو بھی خیال نہیں ہے آنے والے چند مہینوں میں مسلم لیگ کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔

آخر میں مجھے اندرون سندھ سے ایک پولیس آفیسر کا درد بھرا خط ملا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ صرف اور صرف حلال کی کمائی یعنی تنخواہ پر گزر بسر کر رہا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا بار بار ٹرانسفر کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ افسر بالا کی خواہشات پوری نہیں کر سکتا۔ وہ حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حرام کی کمائی وہ کھانا نہیں چاہتا۔ حلال کی کمائی سے وہ بمشکل گھر کا خرچہ چلا رہا ہے۔ اس لئے حج نہیں کر سکتا۔ بتائیں میں کیا کروں۔ میرا جواب یہ ہے کہ اسلام نے حج صرف صاحب استطاعت پر فرض کیا ہے وہ اگر حلال کی کمائی کھا رہا ہے تو وہ اس سے بہتر ہے جو حرام کی کمائی سے حج کرتا ہے۔ ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ جس کا بلاوا وہاں سے آتا ہے وہی جا سکتا ہے لہٰذا جب اس کا بلاوا آئے گا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو روک نہیں سکتی اور جب تک بلاوا نہیں آتا دنیا کی کوئی طاقت اس کو بھیج نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن ان کی خواہش ضرور پوری کرے گا۔

01st December, 2000

بیماریاں وران کا علاج

پچھلے ہفتے میں نے ایک کالم لکھا تھا جس کا عنوان تھا کہ ''یہ ہفتہ کیسا رہے گا'' اس کالم کو بہت سے قارئین نے خطوط، ذاتی ملاقاتوں اور ٹیلی فون کر کے سراہا اور ساتھ ساتھ فرمائش بھی کر ڈالی کہ اس ہوش ربا مہنگائی کے دور میں اور خاص طور پر رمضان المبارک کی مہنگائی جس کا اثر دو چار ماہ تک رہتا ہے، اسی طرح کا دلربا کالم لکھ کر قارئین کو خوش کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو خوش رکھے گا بہت سے دوستوں نے یہاں تک کہا کہ بجلی کے بل اور چینی کی مہنگائی کا رونا ہرگز نہ رونا ورنہ تمام خوشی پر ان دونوں کا سایہ پڑ جانے سے ہماری عید بھی خراب گزرے گی۔ اس لئے میں نے اس کالم میں تمام دکھڑے لپیٹ کر امریکہ روانہ کر دیئے ہیں تاکہ ان سب کا سایہ آنے والے صدر پر پڑے اور وہ بھی سمجھ لے کہ اقتدار اور سیاست کی جنگ وہ ہمارے جیسے پسماندہ ملکوں پر ٹھونس کر خود بھی آرام سے نہیں بیٹھ سکتے اور اب لاکھ ان کی عدالتیں مسٹر بش یا مسٹر الگور کو فاتح قرار دے دیں تو بھی دونوں فریقین اب صدارت سے کم پر راضی نہیں ہوں گے اور ان کے عوام جس طرح ہم بجلی اور چینی کو ترس رہے ہیں وہ اپنے صدر کو بھی ترستے رہیں گے۔ صبح کا اخبار صدر بش لکھے گا تو شام کا ضمیمہ الگور کی گنتی میں سبقت بتائے گا اور اس طرح صدر کلنٹن وہائٹ ہاؤس میں مزے کر رہے ہوں گے۔

خیر اس ہفتے کے کالم کا عنوان ''آپ کی بیماریاں اور ان کا علاج'' ہے۔ اس سلسلے میں ملنے والے خطوط کی روشنی میں راقم الحروف اگرچہ باقاعدہ معالج تو نہیں ہے مگر تمام رسالوں سے جمع شدہ طبی اور سیاسی مشوروں کی روشنی میں حتی الامکان کوشش یہی کی گئی ہے کہ صحیح صحیح جوابات دیئے جائیں تاکہ قارئین آئندہ بھی ہم سب استفادہ کر سکیں۔

سب سے پہلا خط مجھے جس قاری نے لکھا ہے اس نے نام اور پتہ شائع نہ کرنے کی درخواست کی ہے اس

نے لکھا ہے کہ میں بہت عرصے سے پاکستان ٹیلی ویژن پر ایک چوتھائی صدی سے زیادہ پروگرام کرتا رہا ہوں اور چیخ چیخ کر عوام کو متاثر بھی کر چکا تھا کہ غلطی سے ایک دن اسی چیک و پکار کی عادت مجھے سپریم کورٹ تک لے گئی، میں سمجھا کہ یہ بھی شاید میراٹی ویکا پروگرام ہے لہٰذا چیخ چیخ کر تمام ججوں کو بھگا دیا۔ مجھ پر اس وقت مرحوم سلطان راہی کی روح سوار تھی۔ حکومت بھی اپنی تھی، اور اللہ نے خیر کر لی مگر یکا یک آسمان بدلا دشمنوں کی نظر لگی، سلطان راہی کی روح بھی بھاگ گئی۔ اب مجھے سزا ہو گئی ہے چلو میں نے خوشی خوشی سزا بھگت لی مگر اس بے وفا ٹیوی نے جیل سے رہا ہونے کے باوجود مجھے اندر نہیں آنے دیا، میرے تمام ریکارڈ کئے گئے پروگرام بھی کینسل کر دیئے گئے میں دانے دانے کو محتاج ہوں بتائیں میں کیا کروں۔ اب تو آواز بھی بیٹھ گئی ہے۔ (ظ۔ ع۔ ل)

جواب: اے میرے عزیز چونکہ تم نے نام اور پتہ لکھنے کو منع کیا ہے تو تم اپنے تینوں پرانے مرشدوں سے پوچھو، جن کے دور میں اپنا قبلہ بدل کر ٹی وی پر ان کا راگ الاپتے تھے ان میں سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں دوسرے ملک بدر اور تیسرے اٹک جل میں ہیں اور موجودہ تمہارے شعبدوں سے واقف ہیں ان پر تمہارا اثر فی الحال نہیں پڑے گا۔ نام اور پتہ بدل کر اب کاروبار شروع کر دو ویسے بھی بچے ہوئے انعامات محفوظ ہوں گے۔

دوسرا خط لاہور سے ایک سیاسی کارکن نے لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں شروع سے مسلم لیگ کا شیدائی رہا ہوں کیونکہ اس کو ماننے والا کبھی بھوکا نہیں مرتا اور نہ کبھی جیل جاتا ہے۔ ہر دور میں یہ امرت دھارا کا کردار ادا کرتی رہی ہے مگر اس پر بھی برا وقت آ گیا ہے۔ یہ اب اس بکرے کی طرح ہے جس کا آدھا دھڑ الگ پڑا ہے۔ چانپیں چوہدری صاحبان کے حصے میں ہیں، مغز پر میاں اظہر کا قبضہ ہے، رانیں میاں اعجاز الحق دبائے بیٹھے ہیں۔ ای این ٹی یعنی کان، ناک، آنکھیں میاں خورشید قصوری کے حصے میں آئی ہیں۔ بقایا چھچھڑے کارکنوں کے حصے میں آئے ہیں۔ اب میں جاؤں تو جاؤں کہاں اور سب ہی اقتدار کے دعوے کر رہے ہیں۔ کس پر اعتبار کروں؟ جواب جلد دیجئے گا۔ (میاں دفلی ملتان)

اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ آرام سے بیٹھے رہو یار لوگوں نے مرحوم ضیاء الحق صاحب کو گیارہ سال میں بھی کنفیوز نہیں کیا تھا مگر موجودہ چیف ایگزیکٹو کو ایک سال میں ہی کنفیوز کر دیا ہے وہ اب لوگوں کو بلا بلا کر

مشورے کر رہے ہیں۔

جن جن سیاستدانوں کا نام اوپر لکھا ہے ایک کو چھوڑ کر تمام ہی ان سے مل کر آ چکے ہیں۔ مسلم لیگ کے زائچے میں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔

تیسرے قاری نے لکھا ہے کہ مجھے کبھی کبھی وہم ہونے لگتا ہے کہ ''پی پی پی'' پھر سے اقتدار میں آ رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم مہاجروں کا کیا ہوگا۔ (صابر بڈھا)

جواب: جب سے مسلم لیگ اور پی پی پی کو آقائے سیاست حضرت مولانا نصر اللہ خان نے جی ڈی اے میں ساتھ بٹھا لیا ہے دونوں ہی سیاست سے باہر رہیں گی کیونکہ آج تک جس گروپ کی قیادت نصر اللہ خان صاحب نے کی ہے اللہ نے ان کو آزمائش میں نہیں ڈالا۔ لہٰذا یہ وہم دل سے نکال دو اور اشتہاری لوگوں سے دور رہو۔

چوتھے قاری نے لکھا ہے کہ مجھے ہر گھنٹے کے بعد پیشاب آتا ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی خواب میں ہر وقت فاروق آدم کا چہرہ گھومتا ہے۔ بتایئے میں کیا کروں؟ (جام رحمت علی)

بھائی لگتا ہے تم نے بینک سے لمبا ہی قرض معاف کروایا ہوا ہے یا تمہارا تعلق وفاقی وزیر یا اس کے بھائی سے لگتا ہے، بہتر تو یہی ہے کہ تم از خود جا کر بینک کو رقم لوٹا دو یا ہماری حکومت کی طرح ری شیڈولنگ کروالو، نہیں تو پھر ایک ایک گھنٹے کے بجائے سارا پیشاب نہ خطاء ہو جائے اب بھی وقت ہے ویسے اب خواب میں فاروق آدم نہیں آئیں گے کیونکہ آج کل وہ خود فارغ بیٹھے ہیں۔

آخری قاری نے لکھا ہے کہ ایک سال سے میرا پیٹ پھولا پھولا رہتا ہے بھوک بھی نہیں لگتی ہے، لگتا ہے دروازے کے باہر کوئی ٹہل رہا ہے۔ ہر گھنٹی پر چونک پڑتا ہوں۔ نہ دن کو سکون ہے نہ رات کو میں بہت بڑے عہدے پر تھا مگر اب یار دوست تک ملنے نہیں آتے ہیں، بیوی کے رشتے دار طعنے دیتے ہیں۔ بتائیں ایسے میں، میں کیا کروں؟ (بیزار نقوی)

بھائی بیزار نقوی صاحب! اللہ آپ کے گناہوں پر سے پردہ اٹھا رہا ہے آپ بھی وہی نسخہ آزمائیں جو میں نے آج کے کالم میں جام رحمت علی کو بتایا ہے۔ کیونکہ مجھے آپ دونوں کا مسئلہ ایک ہی جیسا لگتا ہے، جتنا جلدی آپ نے نسخے پر عمل کیا انشاء اللہ اتنی ہی جلدی افاقہ ہوگا۔ دن میں چالیس مرتبہ ''آلتو جلالتو صاحب کمال تو''

پڑھیں اور ایک کروڑ کا فوری صدقہ کریں۔

آخر میں قارئین سے درخواست ہے کہ تمام نسخے اپنے بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں اگر مرض کی علامات برقرار رہیں تو فوراً اپنے وکیل سے مشورہ کریں۔

08th December, 2000

ظلمتوں کے پہاڑ

چند سال قبل ایک شعر میری نگاہ سے گزرا تھا۔ شعر تو یاد نہیں رہا مگر مفہوم اس کا کچھ اس طرح تھا کہ ٹوٹی کشتی ہو آندھی اور اندھیرے میں طوفان سمندر میں نظر آ رہا ہو یہ مصیبت یا قیامت کچھ کم تھی کہ ناخدا تم ہو۔ یہی حال اس وقت ہمارے ملک میں ہے ٹیکسوں کا نظام اپنی جولانی پر ہے۔ ہر ہر قدم ہمارے ٹیکسوں کی وصولیابی کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر جب سے یہ فوجی حکومت آئی ہے اور اس نے ٹیکس وصول کرنے والے اداروں سے ایک ہزار سے زائد افراد کو نکالا ہے۔ انہوں نے غالباً اپنا بدلہ لینے کے لئے اس موجودہ حکومت کو ہدف تنقید بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہمارے چیف ایگزیکٹو جنہوں نے ٹیکس وصول کرنے کے لئے ایسے جال میں ڈال رکھا ہے جہاں سے صرف غریبوں کی بددعائیں، تاجروں کی ہڑتالیں اور ملک کی معیشت کی بدحالی اب زیادہ دور نہیں رہی ہے۔

ناانصافی، غربت اور بے روزگاری، جس کی وجہ سے خودکشی اور خودسوزی، اخبارات کی روزمرہ کی زینت بنتی جا رہی ہے تو دوسری طرف تاجروں اور صنعت کاروں کو ٹیکس سروے جی ایس ٹی میں الجھا کر ہماری معیشت کو بری طرح تباہ کیا جا رہا ہے۔ ہم کو سوچنا چاہئے کہ ایسے ایسے ظالمانہ قوانین جو تجارت اور صنعت سازی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں کہیں بھارتی ایجنٹوں اور ان کے کارندوں نے چپکے چپکے ہمارے سرکاری محکموں میں داخل ہو کر ہماری معیشت کا بیڑہ غرق کرنے کا پلان بنا رکھا ہو اور ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے دشمن کی اس چال کا شکار ہو رہے ہوں کیونکہ سرحدوں پر تو ہماری افواج نے ان کو پوری دنیا کے سامنے رسوا کر رکھا تھا شاید اس کا بدلہ وہ ہمارے اپنے ہی کارندوں سے لے کر ہم کو اقتصادی طور پر تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہوں اور ہم اپنی ناسمجھی میں ٹیکس کی آڑ میں اپنی ایکسپورٹ کو ختم کرنے کے درپہ ہوں کیونکہ حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر

صبح ایک نئی مصیبت نازل کردی جاتی ہے خواہ وہ نئے ٹیکس کی شکل میں ہو یا قیمتوں کے اضافہ کی شکل میں ہو، کیا یہی ٹیکسوں کا نظام بھارت میں نہیں ہے؟ آج پچاس سال سے ٹیکس گزاروں سے ٹیکس سروے کیا معنی رکھتا ہے۔ دنیا میں خریداروں سے جی ایس ٹی وصول کیا جاتا ہے مگر ہمارے ملک میں یہ انوکھا نظام کس نے متعارف کروایا ہے کہ جی ایس ٹی صنعت کاروں اور تاجروں کے کندھوں پر ڈال کر تجارتی منڈیوں میں اندھیرا کردیا گیا ہے اور اس پر بھی بس نہیں کیا گیا بلکہ ان پر جرمانوں (جن کی کوئی حد نہیں ہے)، گرفتاریوں کی آڑ میں صنعت کشی کی تیاریاں موجودہ حکومت کی بدنامی کا پیش خیمہ ہوں گی۔ اب کونسی چیز پر جی ایس ٹی نہیں ہے دنیا میں خدمت یعنی ٹیلی فون، ہوائی سفر، گیس، بجلی اور پانی پر کہیں بھی خاص طور پر صنعتکاری کے لئے کوئی خدمات نہیں ہوتیں تاکہ عوام اور ایکسپورٹ کے لئے ہم کمپیٹیشن کرسکیں اور ایک نہیں کئی کئی مرحلوں پر یہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ کیا خود حکومت اپنے واجبات وقت پر ادا کرتی ہے اور کیا اگر وہ وقت پر نہیں ادا کرتی تو کتنا جرمانہ ملا کر ادا کرتی ہے، جو وہ اپنے ٹیکس دینے والے سے کئی کئی گنا جرمانہ وصول کرتی ہے۔

کراچی میں آج ہی ایک تاجر کی خودکشی کی تصویر اخبارات میں چھپی ہے اس سے قبل اسلام آباد کے ایک تاجر نے بھرے بازار میں اپنے آپ کو گولی مار کر ختم کرلیا تھا، یہی نہیں فیصل آباد میں بھی ٹیکس سروے کے دوران ایک تاجر نے اسی ظالمانہ نظام سے تنگ آ کر اپنے آپ کو ختم کرلیا تھا۔

کیا حکومت صرف ٹیکس وصول کرنے کا نام رہ گئی ہے۔ کوئی تو ہو جو ان کو ریلیف دینے کی بات کرے۔ یورپ اور امریکہ میں صرف دو محکمے ٹیکس وصول کرتے ہیں، ایک انکم ٹیکس دوسرا عوامی خریداری یعنی (V.A.T.) یا (G.S.T.) ٹیکس جو صرف اور صرف خریداروں سے وصول کیا جاتا ہے مگر اس کے بدلے تعلیم، سڑکیں، باغات، کھیلوں کے میدان، ہسپتال، بے روزگاری الاؤنس، بے گھر الاؤنس، غربت الاؤنس، بڑھاپے کی تا مرگ پینشن جیسی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ٹیکس وصول کر کے ٹیکس دینے والوں پر ہی خرچ کیا جاتا ہے۔

مگر ہمارے ملک میں ان میں سے کتنی سہولتیں موجود ہیں، ہسپتال ہیں تو ڈاکٹر اور ادویات غائب، اسکول ہیں تو بیٹھنے کی بینچیں غائب، اساتذہ پرائیویٹ حاضر ہیں کیا آج تک محکمہ انکم ٹیکس کی طرف سے کسی صنعت کے بند ہوجانے پر کوئی امداد دی گئی ہے تاکہ سالہا سال سے ٹیکس گزار اپنی صنعت کو دوبارہ لگا سکیں۔ کیا کسی بے

روزگار کو آج تک بے روزگاری الاؤنس دیا گیا ہے، کیا آج تک بے گھر کے لئے کسی نے سوچا ہے اگر کسی مصیبت کے مارے نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کی ادائیگی میں دیر کردی یا وہ کسی دنیاوی مصیبت میں پھنس گیا تو کیا اس ادارے نے کوئی مدد کی بلکہ الٹا اس کا مکان خالی کروالیا اور جو رقم ادا بھی کی تھی وہ بھی ضبط کرلی۔ تاجروں اور صنعت کاروں پر تو مہنگائی کا الزام لگا کر سزائیں مقرر کر رکھی ہیں مگر کیا تاجروں نے ڈالر 61 روپے کیا ہے۔ کیا تاجروں نے پیٹرول 30 روپے لیٹر مقرر کیا ہے، کیا بجلی 10 روپے فی کلوواٹ تک بڑھادی ہے، کیا اتنے زیادہ نرخ مقرر کر کے بھی جب چین نہیں آیا تو اس پر 16.50 فیصد جی ایس ٹی تاجروں کی جیب میں جارہا ہے؟ دھاندلی کی انتہا تو دیکھئے دنیا میں ٹیلی فون کا نظام آج کوڑوں کے بھاؤ آچکا ہے آپ انٹرنیٹ سے پوری دنیا سے 20 روپے فی گھنٹہ تو رابطہ کرسکتے ہیں مگر ٹیلی فون کی صرف انکمنگ مفت کی آڑ میں ٹیلی فون کرنے والے سے 3.50 روپے فی منٹ یعنی 210 روپے فی گھنٹہ لوکل ریٹ وصول کئے جارہے ہیں۔ یعنی امریکہ اور یورپ انٹرنیٹ 30 پیسے فی منٹ اور حیدرآباد کی کال 15 روپے میں بک ہوگی۔ اسلام آباد بات کرنے میں 24 یونٹ فی منٹ چارجز لگیں گے جو کہ دو روپے پچاس پیسے کا ایک یونٹ پڑتا ہے اور اس پر بھی بس نہیں جی ایس ٹی ساڑھے سولہ فیصد، انکم ٹیکس، میٹر ٹیکس، زرضمانت، کنیکشن چارجز وغیرہ وغیرہ علیحدہ ہیں۔ جعلی (اور محکمہ سے مل کر) جگہ جگہ پی سی او کام کررہے ہیں جہاں پوری دنیا میں جس جگہ چاہو پانچ سے دس روپے فی منٹ بات کرلو جس ملک میں اتنی مہنگی ٹیلی فون کی سہولت ہو اور اس ملک میں پانچ پانچ سال تک ٹیلی فون کی ڈائریکٹری تک نہ چھپے جہاں ٹیلی فون انکوائری پر گھنٹوں کوئی جواب نہ ملے اگر خدانخواستہ کسی نے اٹھالیا تو جواب دیا جاتا ہے کہ آواز صاف نہیں آرہی ہے، دوبارہ ڈائل کرو۔ اگر سپروائزر کو ملایا جائے تو وہاں ہولڈ کروا کر صارفین کو پریشان کیا جاتا ہے۔ صرف آئی ایس ڈی یعنی انٹرنیشنل کالز فوری مل جاتی ہے۔

اب عوام کے ٹیلی فون سے ''زیرو'' ڈائل کرنے والی سہولت بھی واپس لے لی گئی ہے گویا اب غریب عوام موبائل مقامی طور پر بھی ڈائل نہیں کرسکتے۔ اس کے لئے انہیں ملکی ڈائل کرنے کی سہولت لینی پڑے گی۔ ورنہ پی سی او جانا پڑے گا حالانکہ لوکل موبائل ڈائل کرنا ہے۔ اگر بے چارہ ملکی سہولت لے تو اس کے ٹیلی فون سے کوئی بھی لوکل کی آڑ میں پورے ملک میں ڈائل کر کے اس کے دن کا چین اور راتوں کی نیند خراب کرسکتا ہے۔ کون بھرے گا اس کا بل اگر کسی نے اس کے ساتھ کام دکھا دیا۔ بہت سی پڑوسنیں اسی بہانے دوسرے شہر

میں رہنے والے رشتہ داروں کے ہاں پڑوس میں جا کر یہ کہیں گی کہ اے بہن ذرا میں اپنی بہن کو ٹیلی فون کرلوں اس بہانے کہ دوسرے شہروں میں ٹیلی فون کر کے پڑوسی کا حق ادا کریں گی۔ تقریباً سارے ہی کالم نگار لکھ لکھ کر تھک چکے ہیں۔ حکمرانوں کے کانوں پر کوئی جوں تک نہیں رینگتی چلو اب رات گہری ہوتی جارہی ہے کل صبح پھر اٹھ کر اخبار پڑھنا ہے کہ رات کس کس کی زندگیوں کے تار ٹوٹے اور کن کن پر ظلمتوں کے پہاڑ گرے۔

ظلمتوں میں گھرا تھا سحر کی تلاش تھی
مجھے اپنے ہی گھر میں آج گھر کی تلاش تھی

14th December, 2000

الوداع اے احتساب الوداع

اتفاق سے آج میں اپنے تمام خاندان کے ساتھ عمرہ کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب روانہ ہورہا ہوں۔ جہاں انشاءاللہ ہم اپنی مرضی سے عمرہ کریں گے۔ پھر چند یوم مدینہ منورہ میں گزاریں گے۔ واپس مکہ مکرمہ آ کر پھر عمرہ کریں گے۔ اس دوران عید ہوجائے گی۔ عید کی نماز پڑھ کر واپس انشاءاللہ اپنے ملک میں آجائیں گے۔ میری آنکھوں میں صرف دوسال قبل اسی رمضان المبارک کی 27 ویں شب گھوم رہی ہے رات کا پہر ہے ہم طواف کعبہ کررہے ہیں اچانک شور ہوتا ہے۔ پولیس کے اہلکار عمرہ کرنے والوں کو ایک طرف ڈھکیل رہے ہیں۔ اور رسی کی مدد سے خانہ کعبہ کے گرد چاروں طرف گھیرا کر لیتے ہیں۔ عام آدمی اب خانہ کعبہ سے کچھ فاصلے پر طواف کرنے لگتے ہیں۔ درمیان کی جگہ میں چند چہرے نمودار ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے میاں شریف ان کے پیچھے نواز شریف، شہباز شریف ساتھ ساتھ اعجاز الحق، شیخ رشید، کلثوم نواز، والدہ نواز شریف (جو کافی بوڑھی تھیں) سفارت کار تمام احرام کی حالت میں جلدی جلدی پولیس کے حلقہ میں طواف شروع کرتے ہیں۔ مجمع کی زیادتی کی وجہ سے ہم آدھے گھنٹے میں صرف تین طواف کر سکے تھے جبکہ یہ قافلہ صرف 15 منٹ میں آناً فاناً طواف کر کے پولیس کے حصار میں صفاء مروہ کی طرف رواں دواں ہوجاتا ہے کہ نہ انہیں قطار کی ضرورت نہ دھکم پیلی، نہ لمبے لمبے طواف کرنے کی سعی نہ جانے اتنی جلدی دعائیں اور کلمات کیسے ادا ہوگئے۔ خانہ کعبہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کا سفر چند منٹ میں ختم ہوگیا۔ چلو بھئی یہ سرکاری عمرہ ختم ہوگیا۔ آگے پیچھے بے شمار پولیس کی گاڑیاں، سادہ کپڑوں میں افسران جو عربی جبوں میں ملبوس بس اس فکر میں تھے کسی طرح بھی ہو یہ قافلہ جلد از جلد اپنا کام مکمل کرے اور واپس اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ جونہی یہ قافلہ واپس جاتا ہے ہلچل بند ہوجاتی ہے دھکم پیلی رک جاتی ہے۔ عازمین اب دوبارہ اطمینان سے پھر سے

اپنے اپنے طواف میں لگ جاتے ہیں۔کون جانتا تھا کہ ان کا آخری سرکاری عمرہ ہے۔پھر کون اس طرح ان کو لائے گا اور فٹافٹ عمرہ کروا کر واپس اعزاز کے ساتھ لے جائے گا۔بیان کرنے کا مقصد قدرت کا اپنا ایک انداز ہے کہ ایک شخص جس کے پاس عوام کا سب سے بڑا مینڈیٹ ہو اور اس کو راتوں رات تخت سے تختہ کر دیا جائے اور ایک عورت کے علاوہ (کلثوم نواز) کوئی صدائے احتجاج تک بلند نہ ہو۔پھر کال کوٹھری اس کا مقدر بنے۔سزائیں ہوں، جرمانے ہوں، پوری دنیا میں اس کی خواری ہو۔جس طرح اور مجرموں کی ہوتی ہے مگر ابھی یہ سین اپنے اختتام کو نہیں پہنچتا کہ ساری فلم الٹ کر مکافات عمل سے نکال کر اس کے منطقی انجام کو پہنچانے کے بجائے اسی خاندان کو یکا یک بیمار بنا کر (جس میں ابا جی کے سوا) تمام کے تمام ہٹے کٹے تیز تیز ڈک بھرتے ہوئے گرم گرم طیارے میں سوار کرا کے اہل وطن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سعودی عرب روانہ کر دیئے جاتے ہیں۔عوام کے لئے یہ اعلان کافی ہے کہ ہم نے نواز شریف خاندان کو جلاوطن کر کے اپنے جرمانے وصول کر لئے ہیں۔ 30 کروڑ نقد، ایک ماڈل ٹاؤن کا مکان وغیرہ وغیرہ۔چلو بھئی چھٹی ہوئی وہ جو کھربوں دبائے بیٹھے تھے۔کوڑیوں کے مول چھوٹ گئے۔عوام کو سکتہ ہو گیا۔خواص مسکرانے لگے۔صحافی تھرتھرانے لگے۔ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق سوچا، کہا، لکھا، یہ راتوں رات کیسا انقلاب دوبارہ آیا۔کیا اسی دن کے لئے احتساب شروع کیا تھا۔فوج کا ایک آخری بھرم تھا کہ یہ شفاف احتساب کر کے عوام کی لوٹی ہوئی رقم لائے گی۔پھر ملک میں کوئی بدعنوان سیاست دان نہیں رہے گا سب کے سب سزا پائیں گے۔عوام خوشحال ہو جائیں گے۔مگر ایک ہی جھٹکے سے تمام خواب چکنا چور ہو گئے۔اہل قلم دم بخود ہو گئے۔

ہماری عدلیہ کا دہشت گرد بغیر ٹکٹ وی آئی پی کی حیثیت سے دوبارہ ہماری سرحدوں سے دور روانہ کیا جا رہا ہے تمام سزائیں خود اس کے لائے ہوئے صدر کے ذریعے معاف کروا دی گئیں جو کارخانے چل رہے ہیں وہ حمزہ شہباز کی تحویل میں اور جو بند ہیں وہ سرکاری تحویل میں دے دیئے گئے۔جو بینکوں سے ری شیڈولنگ کروائی تھی اس کا کیا ہوا۔اس پر ہی بس نہیں ہوا۔اپنے جنرل منیجروں کو عام ملازموں کے کپڑے پہنا کر ذاتی ملازمین بنا کر ساتھ لے گئے گویا کہ ثبوت بھی مٹا دیا گیا۔قوم سے اس سے بڑا بھیانک مذاق غالباً ممکن نہیں ہو سکتا اور سونے پر سہاگہ محترمہ کلثوم نواز کا بیان ہم چند دن میں واپس آ رہے ہیں اور صرف سعودی عرب میں علاج کروانے جا رہے ہیں، کہاں ہے ہمارا معافی نامہ جواب قوم کو ملنا چاہئے۔ڈیل کیا ہوئی، کس

سے ہوئی، گارنٹی کس کی ہے؟

روز اخبارات کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔1971ء کے بعد اگر کوئی غور کرے۔کیا ہماری فوج کا مورال دوبارہ ڈاؤن نہیں ہوا۔حکومت عوام کے سامنے شرمندہ نہیں ہوئی۔سرکاری ترجمان بغلیں جھانک رہے ہیں آنے والے دن پراسرار ہوتے جا رہے ہیں۔عوام کا اعتبار اور اعتماد تو ختم ہو گیا۔کس منہ سے احتساب کا عمل اب جاری رہ سکتا ہے۔قوم جو ریلیف ریلیف کی صدا لگا رہی تھی۔سو روپے دے کر اس کا بھی منہ بند کر دیا گیا ہے سوچنے کی بات ہے۔افغانستان جیسا چھوٹا ملک امریکہ کو اپنے محسن اسامہ بن لادن کو واپس نہیں کرتا کیونکہ کل تک امریکہ اس کو مجاہد کہتا تھا آج ان کی نگاہ میں دہشت گرد ہے جبکہ کل کا وزیراعظم ہماری عدلیہ نے دہشت گرد قرار دے دیا تو ہم نے گھٹنے ٹیک دیئے اور راتوں رات ہم نے ان کے حوالے کر دیا۔اگر کل بھارت دہشت گردوں کی لسٹ ہمارے ہاتھ میں تھما دے اور ساتھ ساتھ ان کی قیمت بھی لگا دے تو کیا ہم اپنے شہری اس کے حوالے کر دیں گے۔اگر کوئی اور منظور نظر نکل آیا تو کیا اسے بھی جلاوطن کر دیں گے اور اس کو اس ملک کے حوالے کر دیں گے۔

سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ امریکہ جو بار بار اس خطہ میں امن کی بات کرتا ہے۔دراصل وہ کشمیر کا سودا کروانے والا ہے۔اسی لئے دونوں بڑی پارٹیوں کو عوام سے دور کر کے ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے جس کے لئے ایک وزیراعظم کو ملک سے باہر کر کے اور دوسرے کو جلاوطن کر کے جلد ہی آپ کوئی فارمولا سنیں گے اور پھر کشمیر کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔کیونکہ جو بھی فیصلہ ہو گا اس میں بھارت ہی کا پلڑا بھاری ہو گا۔دیکھئے یہ خفیہ معاہدہ کب تک سامنے آئے گا۔قوم اس کے لئے بھی تیار رہے۔ایسے ایسے تماشے اب قوم کے مقدر بن چکے ہیں فی الحال تو ایسا لگ رہا ہے کہ الوداع۔اے احتساب الوداع۔

26th December, 2000

یہ کیسی شرمندگی ہے؟

بنگلہ دیش بنے ہوئے آج تیس سال ہونے کو ہیں۔ مگر ہم آج تک یہ طے نہیں کر سکے کہ بنگلہ دیش کیوں بنا کس نے بنوایا۔ مکتی باہنی (مسلح نیم فوجی ٹولہ) اور ہماری افواج پاکستان کا کیا کردار رہا تھا۔ آج تک ان پر پردہ پڑا ہوا ہے صرف ایک جملے نے ہمارے سفارت کار کو بے عزت کر کے بنگلہ دیش بدر کر دیا اور ہماری حکومت نے احتجاج کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ افسوس صد افسوس۔ ناکردہ گناہ کی کتنی بے عزتی سے ہم نے اپنے سفارت کار کو واپس بلوایا۔

یہ فروری 1967ء یعنی بنگلہ دیش بننے سے صرف چار سال پہلے میں پہلی مرتبہ مشرقی پاکستان گیا تھا۔ ایوب خان حکومت نے نئی نئی صنعت سازی کے لئے مشرقی پاکستان میں بڑی بڑی مراعات رکھی ہوئی تھیں۔ سوچا چلو مشرقی پاکستان میں فیکٹری لگا لیتے ہیں۔ یہ جائزہ لینے کے لئے میں ایک امریکن کمپنی کے سربراہ کے ساتھ ڈھاکہ گیا۔ کئی دن تک ہم کاروباری جائزہ لیتے رہے اور تقریباً ہم نے مشترکہ فیکٹری لگانے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ دوپہر کا وقت تھا ہم انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل سے واپس کراچی آنے کے لئے روانہ ہوئے۔ اس دن ہڑتال تھی معلوم ہوا کہ فروری میں بنگلہ زبان کی حمایت میں جلوس نکالے جاتے ہیں۔ ہڑتال ہوتی ہے جگہ جگہ مظاہرے ہوتے ہیں۔ جب ہوٹل سے ٹیکسی میں روانہ ہوئے تو راستہ سنسان تھا۔ کچھ دور جا کر ایک سگنل پر اسٹوڈنٹس جمع تھے۔ نعرے بازی ہو رہی تھی۔ ہماری ٹیکسی جب وہاں پہنچی تو ان اسٹوڈنٹس نے ہماری ٹیکسی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کیا معاملہ ہے۔ ڈرائیور بنگالی تھا۔ اس نے بتایا آج ہڑتال ہے یہ اسٹوڈنٹس لینگویج ڈے مناتے ہیں۔ میں نے گاڑی کا شیشہ اتار کر پوچھا ہم کو کیوں روکا ہے۔ اس پر لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بنگلہ زبان میں آپس میں کہا کہ یہ ''بہاری'' ہے اس سے سو

روپے چندہ لو اس زمانے میں سو روپے بہت ہوتے تھے اس سے اندازہ لگائیے کہ انٹر کانٹی نینٹل کا کرایہ 60 روپے تھا۔ میں نے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر ان طالب علموں کو دیا تو انہوں نے بڑی حقارت سے کہا کہ ہمارے ملک میں رہتے ہو، کھاتے ہو اور ساری کمائی مغربی پاکستان لے جاتے ہو۔ نکالو سو روپے ورنہ ابھی ہم بتاتے ہیں کہ تم آگے کیسے جاؤ گے۔ میں نے ڈر کے جلدی سے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور ڈرائیور کی جانب سے ان طالب علموں کو دیدیا۔ ڈرائیور نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو یہ تمہارا ملک نہیں بلکہ بنگالیوں کا ملک ہے اور انہی کا راج چلے گا۔

خیر آگے بڑھ گئے یہی عمل اگلے سگنل پر ہوا۔ غنڈوں اور نوجوانوں کی ٹولیاں جگہ جگہ جمع تھیں۔ وہ صرف مغربی پاکستانیوں سے جنہیں ان کی بنگالی اصطلاح میں ''بہاری'' کہتے تھے ہر سگنل پر ذلیل کر کے زبردستی بڑی بڑی رقم وصول کر رہے تھے۔

اللہ اللہ کر کے ڈھاکہ ایئرپورٹ پہنچا۔ جب اتر کر میں نے ڈرائیور کو طے شدہ کرائے یعنی پانچ روپے کا نوٹ دیا تو وہ بپھر گیا اور کہنے لگا بابو آج تو پچاس روپے نکالو۔ میں نے اس کو بھی پچاس روپے نکال کر دیئے۔ اس دوران میرا امریکن پارٹنر کچھ کچھ صورتحال بھانپ چکا تھا مگر میں نے اس کو ایئرپورٹ پر کچھ نہیں بتایا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ ہو چکا ہے۔ البتہ میرا ایک دوست جو ایئرپورٹ مجھے چھوڑنے ڈائریکٹ آیا ہوا تھا۔ اس کو میں نے پیشینگوئی کر دی کہ وہ دن دور نہیں جب ہم ''بہاری'' اپنے پاسپورٹ لیکر اس خطہ میں آئیں گے۔ اس کو یقین نہیں آیا تھا۔

جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی میں نے اپنے امریکن پارٹنر کو آگاہ کر دیا کہ ہم مشرقی پاکستان میں امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تو کریں گے مگر فیکٹری نہیں لگائیں گے اور وہی ہوا جس کا خدشہ چار سال قبل میں نے کیا تھا۔ اس چار سال کے دوران میں بار ہا ڈھاکہ اور چٹاگانگ آتا رہا اور کشیدگی کو بڑھتے دیکھتا گیا۔ آخر کار یہ نفرتوں کا لاوا اس وقت پھٹا جب 3 مارچ کو یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس صرف ملتوی کیا تھا۔ لاکھوں بنگالی سڑکوں پر نکل آئے۔ مغربی پاکستانیوں کی دکانیں، کارخانے، ملیں جلا ڈالیں۔ نہتے شہریوں کو مکتی باہنی نے گھروں میں گھس کر لوٹنا شروع کر دیا اور جنہوں نے مزاحمت کی انہیں قتل کر ڈالا۔ شہر بے قابو ہو گیا۔ عوامی لیگ نے متوازی حکومت قائم کر دی۔

شیخ مجیب الرحمٰن اگرتلہ سازش کے ملزم راتوں رات ہیرو بن گئے۔ مغربی پاکستانیوں نے مغربی پاکستان کے لئے نقل مکانی شروع کردی۔ صرف فضائی راستہ تھا۔ پی آئی اے اور ایئرپورٹ پر لوگ پناہ لینے آ گئے۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ خود پولیس اس میں ملوث ہوکر مکتی باہنی کی پشت پناہی کررہی تھی۔ ہزاروں بے گناہ قتل کردیئے گئے عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ بھارت خاموش تماشائی بنا اس کو ہوا دیتا رہا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کی یہی چال تھی کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان بنگالیوں کو مغربی پاکستان کے باشندوں سے لڑوا کر بنگلہ دیش بنوادیا جائے۔ یہاں تک کہ 23 مارچ 1971ء کو تمام ملک میں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرادیا گیا۔ صرف گورنر ہاؤس پر پاکستانی جھنڈا لہراتا رہا۔ کسی نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ کوئی ان بے گناہ شہریوں کی مدد کے لئے نہیں آیا۔ پھر افواج پاکستان حرکت میں آئیں۔ فوجی ایکشن ہوا تو معلوم ہوا کہ اردو بولنے والے کسٹم ہاؤس چٹاگانگ کے سرکاری افسران کو ان کے ماتحت بنگالیوں نے پکڑ کر سرنجوں سے خون نکال نکال کر مارڈالا اور جب فوجی ایکشن کے بعد مجھے چٹاگانگ جانے کا آخری بار اتفاق ہوا (کیونکہ سب نے فیصلہ کرلیا تھا اب مشرقی پاکستان میں کوئی بھی مغربی پاکستانی کاروبار نہیں کرے گا) میں نے چھ ڈرم کسٹم ہاؤس کے باہر خون سے بھرے ہوئے دیکھے تھے۔ عورتوں اور بچوں کے سامنے ان کے مردوں کا دن دہاڑے قتل عام کیا گیا۔ میں نہیں کہتا کہ فوجی ایکشن میں تشدد نہیں تھا۔ بنگالیوں کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی مگر مکتی باہنی کے سامنے اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھی۔ مگر ہندوستان کے ذرائع ابلاغ نے جھوٹی کہانیاں لکھ لکھ کر ہماری افواج کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی صرف ہندو بنگالی جو مکتی باہنی کی پشت پناہی کرکے بے گناہ اردو بولنے والوں کو مروانے میں آگے آگے تھے وہ فوج سے اور موت سے ڈر کر بھارت بھاگ گئے خود عوامی لیگی بھی جان بچا کر بھارت کی گود میں جا بیٹھے۔ یحییٰ خان نشے میں دھت فیصلے کرتا رہا۔ ہمارے سیاست دان اس کو غلط معلومات فراہم کرکے غلط فیصلے کرواتے گئے۔ یہاں تک کے بنگلہ دیش بن گیا۔ حقیقت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جب شیخ مجیب الرحمان کو قید سے رہا کرکے لندن روانہ کیا گیا تو کراچی ایئرپورٹ پر اس نے فوج پر چھ ہزار بنگالیوں کے قتل عام کا الزام لگایا۔ لندن ایئرپورٹ پر پہنچ کر ساٹھ ہزار بنگالیوں کا الزام دہرایا اور بنگلہ دیش میں ایئرپورٹ پہنچ کر یہی تعداد بڑھ کر چھ لاکھ بن گئی۔ جس کو عالمی میڈیا نے خوب اچھالا۔ البتہ جب پاکستان نے احتجاج کیا کہ یہ تعداد خود کراچی ایئرپورٹ کے اعلان سے سوگنا زیادہ ہے۔ تب اقوام متحدہ نے

مقتولوں کی لسٹ طلب کی تو آج تک چند سو سے زیادہ افراد کی لسٹ مہیا نہیں ہوسکی۔ مگر آج خود مجیب الرحمان کی بیٹی پھر چھ لاکھ بنگالیوں کے قتل کا الزام دہراتی ہیں۔ اے میرے نوجوانو اس سے بڑھ کر خود بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمان کو خود اس کی فوج کے میجر فاروق کی بٹالین نے قتل کرڈالا۔ دو دن تک اس کی اور اس کے تمام خاندان کے افراد جوڈھاکہ میں تھے ان کی لاشیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ خود عوام اس کے کھوکھلے دعوؤں اور نعروں سے بیزار تھے۔ کسی نے احتجاج تک نہیں کیا۔ اس کے بعد کئی سال تک عوامی لیگ کو اقتدار میں نہیں آنے دیا۔

بنگالیوں نے ہمیشہ اپنے لیڈروں سے بیوفائی کی۔ وہ کسی سے وفاداری نہیں کرسکتے۔ متحدہ پاکستان میں صرف دس ہزار بنگالی رہتے تھے جبکہ 1972ء سے 1992ء تک یعنی بیس سال تک دس لاکھ سے زیادہ بنگالیوں کو ہم نے ہی نوکریاں دیں۔ آج بھی تین لاکھ بنگالی پاکستان میں روزگار کمارہے ہیں۔ کیا ہم نے ان پر یہ احسان نہیں کیا مجھے صرف ایک ہزار اردو بولنے والے مزدور بنگلہ دیش میں گنوادیں جو پاکستان سے بنگلہ دیش بننے کے بعد نوکری کی تلاش میں بنگلہ دیش گئے ہوں جبکہ یہی عوامی لیگی تھے جب بنگلہ دیش بنا تو انہوں نے دوبارہ قتل عام کیا۔ بچے کھچے اردو بولنے والوں کا قتل عام شروع کردیا وہ تو ہندوستانی فوج نے کلکتہ، نیپال، برما کے راستے پاکستان ہجرت کرنے میں رشوت لے کر مدد کی۔

بنگلہ دیش کو آزادی دلوانے کی رقم ہندوستان نے اس طرح وصول کی کہ تمام جدید مشینریاں جو مغربی پاکستانیوں نے لگائی تھیں تمام کی تمام اکھڑوا کر بھارت راتوں رات منتقل کردیں۔ خود بنگلہ دیش کوئی بھی معاہدہ بیس سال تک ہندوستان کی پیشگی اجازت کے بغیر نہیں کرسکتا تھا اور بنگلہ دیش میں بننے والی ہر چیز پہلے بھارت کا حق بنتی ہے۔ اگر بھارت انکار کرے تب وہ ایکسپورٹ ہوتی ہے۔

25 سال بعد جب میں ڈھاکہ گیا تو وہاں کے تاجر پاکستانیوں کو یاد کرکے روتے تھے۔ انہوں نے بتایا اگر ٹیکسٹائل کا کوٹہ بنگلہ دیش کے لئے آزادانہ ہوتا تو شاید ہم آج بھوکے مررہے ہوتے۔ آج ہر دوسرے گھر سے مرد اور عورتیں غیر ممالک میں معمولی نوکریاں کرکے بقایا خاندان کی کفالت کررہی ہیں۔

اتنا لکھنے کا مقصد کسی کو ذلیل کرنا یا اپنا احسان جتانا منظور نہیں مگر حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں۔ اس وقت یہ ہمارا سب سے بڑا صوبہ تھا اس کو بھی یہ خوش فہمی تھی کہ مشرقی پاکستان کا پٹ سن سونا ہے جس کی ایکسپورٹ پر

مغربی پاکستان زندہ ہے۔مگر جب الگ ہوا تو حقیقت کھلی کہ کون کس پر زندہ ہے اسی طرح ہمارے شہداء جو بنگالیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے اور ہمارا تمام کا تمام سرمایہ جو ایک رات میں لٹ گیا اس پر ہم کو نہیں بنگلہ دیشیوں کو شرمندگی ہونی چاہئے۔

ہمارا ڈپٹی ہائی کمشنر راجہ عرفان منصور الحق ہے اس نے بنگلہ دیشیوں کو صحیح آئینہ دکھایا ہے۔کم از کم حق بات خود ان کے ملک میں کہنے پر وہ زندہ نشان حیدر کا مستحق ہے بنگالی نے کسی کے ساتھ کبھی وفا کی ہے نہ اس سے امید رکھی جاسکتی ہے۔ مجھے تو ورلڈ کپ میں جوئے کی آڑ میں ہارنے پر وسیم اکرم کہ یہ الفاظ کہ ہم اپنے بھائی سے ہارے ہیں زہر میں ڈوبے ہوئے الفاظ لگے تھے۔کیا ایسا ہی بھائی ہوتا ہے جس نے ہمارے ہارنے پر پورے ملک میں جشن منایا اور اس جیت کو 17 دسمبر والی جیت سے تشبیہہ دی اور پورے ملک میں عام تعطیل کر کے ہمیں ذلیل کیا کہ بیس سال تک ہم ان کی کفالت نہ کرتے اور غیر قانونی انہیں اپنے ہاں نوکریاں نہ دیتے تو کتنے خاندان بھوک سے مر جاتے۔اسی بنگالی دوست نے بتایا تھا کہ ہمارے جانے کے بعد انہی ہندو امیر بنگالیوں نے ہماری عورتیں اپنے گھروں میں کام کاج کے لئے رکھیں۔صرف روٹی اور کپڑوں کے عوض خوب کام لیا۔کیسی تنخواہ کیسی مراعات آج بھی ہم ان اچھے دنوں کو یاد کرتے ہیں۔ ہمارے لیڈروں نے ہندوستان کے ہاتھوں پاکستان سے آزاد کروا کر بنگلہ دیش کو خود ان کے پاس گروی رکھوا دیا ہے۔ہم آزاد ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں ہیں۔ ہمارے کاروبار پر بھارتی ہندوؤں کا قبضہ ہے ہمیں پاکستان سے بے وفائی کی سزا آج بھی بھارت کے تسلط کی شکل میں مل رہی ہے ہم کو سیلاب نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا بھارت آج بھی پہنچا رہا ہے اور نہ جانے کب تک ہمیں اس سے نجات ملے گی۔

عمرہ کے فضائل وسائل اور مسائل

پورے عالم اسلام میں شعبان اور رمضان المبارک میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے والوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔اس سال صرف رمضان المبارک میں حکومت سعودیہ کے مطابق تقریباً 25 لاکھ مسلمانوں نے عمرہ کی سعادت حاصل کی اور حرمین شریفین یعنی مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں جمعۃ الوداع کے موقع پر بھی 25 لاکھ مسلمانوں نے نماز جمعہ ادا کی۔زبردست روح پرور مناظر تھے۔اللہ کے فضل وکرم سے خادم نے بھی اس سال عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ان عظیم الشان مجمع کی ذرائع ابلاغ اور خصوصی طور پر سعودی ٹیلی ویژن نے زبردست کوریج کی۔نماز تراویح اور جمعۃ الوداع کی براہ راست پوری دنیا میں ٹیلی کاسٹ کر کے عالم اسلام کو دکھا کر نہ صرف مسلمانوں کی یکجہتی اور ڈسپلن کا مظاہرہ دکھایا بلکہ دیگر قوموں کو یہ پیغام بھی دیا کہ مسلمانان عالم اپنے مذہبی فرائض میں دوسروں سے بہت آگے ہیں۔ان اقدامات میں بلاشبہ سعودی حکومت مبارک باد کی مستحق ہے۔اتنے بڑے مجمع کو صرف جذبہ ایمان ہی سے کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔دنیا بھر کے مسلمان جن کی تہذیب وتمدن اور زبانیں الگ الگ ہوں جو ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہوں مگر صرف اور صرف اسلام سے جڑے ہوں، ایک ساتھ نمازیں ادا کریں روزے افطار کریں۔حرم میں عورتیں بچے، بوڑھے، نوجوان سب بڑے خشوع اور عاجزی سے عبادات کریں طواف کریں، عمرہ کی سعادتیں حاصل کریں پوری دنیا میں حج اور عمرہ کی مثالیں کسی بھی دوسرے مذاہب میں نہیں مل سکتیں۔نہ کوئی ہنگامہ نہ افراتفری اور نہ مسلک کی شناخت۔ایک ہی امام کے پیچھے سب نمازیں ادا ہو رہی ہیں کوئی مسلک آڑے نہیں آرہا ہے نہ ان میں اب کوئی شیعہ ہے نہ سنی نہ دیوبندی۔سب مسلمان ہیں۔کاش یہی عمل اگر سب واپس جا کر اپنے اپنے ملکوں میں دہرائیں تو ہم فرقوں میں تقسیم ہونے سے بچ جائیں گے جس طرح حرم شریف میں ایک دوسرے

کے مسلک کا احترام کرتے ہیں یہی عمل اور احترام عمرہ اور حج ادا کرنے کے بعد جاری رہنا چاہئے۔ اسی کا نام عمرہ اور حج ہے اور یہی مقصد تھا کہ تمام عالم اسلام کے مسلمان حرف شریف میں جمع ہوں اور اسلام کے جذبے کے تحت صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے نمازیں اور طواف کریں اور واپس جب جائیں تو اسی ڈسپلن کا مظاہرہ کریں۔ یہ تو ہوئے عمرہ اور حج کے فضائل اب میں آتا ہوں وسائل کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے حج صرف ان لوگوں پر فرض کیا ہے جن کے پاس اللہ کا دیا ہوا مال ہے وہ زندگی میں صرف ایک مرتبہ ضرور حج کریں۔ زیادہ کرلیں تو زیادہ ثواب ہے اور جن کے پاس وسائل نہیں ہیں ان پر حج بھی فرض نہیں ہے۔ اسی طرح عمرہ بھی انہی لوگوں پر ضروری ہے جن کے پاس دولت ہے اور عمرہ فرض نہیں ہے سنت ہے اس کا ثواب بہت ہے شعبان اور رمضان المبارک میں عمرہ کے بہت فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے مسلمان ویسے تو سارے سال ہی عمرہ کرتے ہیں۔ مگر ان دو مہینوں میں کثرت سے عمرہ کرتے ہیں اور حکومت سعودیہ ان دو ماہ میں خصوصی انتظامات کرتی ہے مگر چونکہ ہر سال اس میں اضافہ ہو رہا ہے اس لئے بہت سے زائرین مشکلات کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ خصوصی طور پر میں اس سال آنے والے زائرین کو جو مشکلات پیش آئی ہیں حکومت پاکستان اور سعودی حکومت کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ سعودی حکومت زائرین اور حجاج کرام کے لئے بہترین انتظامات کرتی ہے مگر اس سال ایک تو ہماری کرنسی کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے اور زیادہ زائرین کے آجانے سے مقامی سعودی لوگوں نے اشیائے صرف کی قیمتیں بہت بڑھا دیں۔ خصوصی طور پر ہوٹلوں کے مالکان نے تو حد کر دی۔ جس کمرہ کا کرایہ عام دنوں میں سو ریال تھا اس سال رمضان میں پانچ سو ریال کر دیا اور آخری دس دن تو ایک ایک ہزار ریال وصول کئے ظلم کی انتہا یہ کر دی۔ آپ اگر پانچ دن ٹھہریں تو بہت سے ہوٹل والوں نے دس دس دن کے یعنی پورے آخری عشرے کا کرایہ وصول کیا۔ میری سعودی حکومت سے گزارش ہے کہ اتنا کرایہ تو پانچ اسٹار ہوٹل بھی پوری دنیا میں نہیں لیتے۔ کجا یہ ایک اسٹار سے بھی نیچے ٹائپ کے ہوٹل کرایہ وصول کرتے ہیں۔ بھلا سولہ ہزار روپے یومیہ کرایہ۔ یہ معمولی ہوٹل والے ان زائرین سے ٹھگتے ہیں۔ ان پر کنٹرول کی ضرورت ہے کمروں میں نرخ لکھے ہوتے ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا سیزن ہے۔ اللہ کے گھر آنے والوں سے حرم کے نزدیک رہائش پر اتنا زیادہ کرایہ یقیناً ظلم ہے ہمارے پاکستانی بھائیوں کی تو اس سال اتنی مہنگائی دیکھ کر چیخیں نکل گئیں۔ بہت لوگ اس خود ساختہ کرایوں کے اضافے

کی شکایتیں کرتے پائے گئے۔ مگر حکومت کی طرف سے کوئی روک تھام نہیں تھی۔ اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء میں بھی خصوصی طور پر اس سال بڑی لوٹ مار تھی جس کا جو دل کرتا تھا دام مانگتا تھا۔ دوسرا بڑا المیہ پاکستان سے جانے والے زائرین کے ساتھ ہماری قومی ایئر لائن اور سعودی ایئر لائن والوں نے واپسی پر بڑی دھاندلی مچائی ہوئی تھی۔ بین الاقوامی قوانین کے مطابق 72 گھنٹے پہلے اگر کسی نے فلائٹ ری کنفرم کروالی ہو تو اس کی سیٹ کینسل (Cancel) نہیں ہو سکتی۔ مگر ان دونوں ایئر لائن والوں نے ایک ہفتہ کی زبردستی شرط رکھ دی کہ ایک ہفتے پہلے ری کنفرم نہیں ہو تو وہ کینسل کر دی۔ پوری پوری فلائٹ کی سیٹیں منسوخ کر دیں۔ بلا کسی وجہ کے۔ ایسے بھی لوگ ملے جنہوں نے جدہ ایئر پورٹ پر اتر کر ری کنفرم کروائی چونکہ ان کو دس بارہ دن بعد جانا تھا جب ایئر پورٹ پہنچے تو پتہ چلا ان کی بھی سیٹ کینسل ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ آپ نیا یک ہفتے قبل یعنی تیسری مرتبہ ری کنفرم کیوں نہیں کروائی اس سال ایک ظلم تو پہلے ہی ہو رہا تھا کہ عید کے نزدیک کی واپسی کی بکنگ بالکل بند تھی۔ دونوں ایئر لائنز کے دفاتر کے باہر زائرین ساری ساری رات واپسی کی سیٹوں کے لئے دھکے کھا رہے تھے۔ ہر نماز کے بعد ان کو قطار لگانے کی فکر تھی۔ گویا وہ عبادت سے زیادہ اب وہ اپنی واپسی کے لئے فکر مند تھے۔ یہ بھی ہوا کہ گھنٹوں کے بعد جب نمبر آیا تو ٹائم ختم ہو گیا۔ اب دوبارہ نماز کے بعد پھر لائن میں لگیں۔ میں نے ایسے بھی لوگ دیکھے جن کی سیٹیں 10 جنوری سے لے کر 20 جنوری تک وہ دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان دس دنوں کے لئے ہمارے پاس کھانے کے بھی پیسے نہیں بچے۔ ہم کیسے دن گزاریں گے۔ خدا کے لئے اسپیشل فلائٹ چلاؤ، ہماری جان چھڑاؤ کیونکہ ان کی سیٹیں اس خود ساختہ قانون کے تحت کینسل ہو چکی تھیں۔ عورتیں اور بوڑھے تو واقعی قابل رحم تھے۔ مگر ان ایئر لائن والوں کے کانوں پر کوئی جوں نہیں رینگ رہی تھی۔ بھلا عید کے بعد دس بیس دن کا اضافی رکنا محال تھا۔ دنیا میں تو مسافروں کی خاطر دن رات فلائٹس چلائی جاتی ہیں۔ میں نے خود دیکھا کہ عید والے دن مصر کی ایئر لائن کے دس طیارے ایئر پورٹ پر اپنے ملک کے زائرین کو لانے اور لے جانے کے لئے کھڑے تھے۔ زائرین کو ایئر پورٹ پر بھی بڑی تکالیف ہوتی ہیں۔ خاص طور پر حج ٹرمینل پر تو پینے کا پانی تک نہیں ملتا کھانے کے اسٹال بھی نہیں کھلے ہوتے۔ گھنٹوں پہلے بلا کر بھیڑ بکریوں کی طرح مسافروں کو ہینڈل کیا جاتا ہے جہاں سعودی حکومت کے دیگر انتظامات بہترین ہوتے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ ایئر پورٹ پر زائرین کے آنے اور جانے کے انتظامات پر خصوصی توجہ کی ضرورت

ہے گھنٹوں لگ جاتے ہیں آدھا آدھا دن صرف آنے اور جانے میں کلیئرنس اور بکنگ میں لگ جاتا ہے جبکہ دنیا میں آج کے دور میں یورپ اور امریکہ جہاں یک وقت میں اس سے بھی زیادہ مسافر ہوتے ہیں۔ صرف آدھے گھنٹے میں مسافر باہر آجاتا ہے۔

حکومت پاکستان اور سعودی حکومت ان مسافروں کو لانے لے جانے کے لئے صرف دو ایئر لائنوں کے بجائے دوسری ایئر لائنوں کو اجازت دے تاکہ ان کی اجارہ داری کی وجہ سے عمرہ زائرین کو نجات ملے اور وہ آسانی سے آجاسکیں اور خصوصی پروازوں کے ذریعے سعودی عرب میں پھنسے ہوئے زائرین کو فوری طور پر واپس لانے کے بندوبست کرے اور ان کو مالی پریشانی سے نکالے۔

19th January, 2001

اندھیرا بڑھ رہا ہے

ایک شادی کی تقریب میں ایک سرکاری ملازم سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ محکمہ کسٹم میں ملازم ہیں اور قلیل تنخواہ کے ساتھ صرف 152 روپے سواری کرایہ اور مکان کے کرایہ کی مد میں ملتے ہیں۔ کیا اس رقم سے کوئی گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر اور مکان کا کرایہ ادا کرسکتا ہے جبکہ وہ رشوت نہیں لیتے۔ صرف اور صرف اپنی تنخواہ اور الاؤنس 152 روپے پر گزارہ کررہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے زور دے کر کہا کہ حکومت سال میں چار پانچ مرتبہ پیٹرول کی قیمت بڑھاتی ہے ٹرانسپورٹرز سے کہتی ہے تم اپنا کرایہ نہیں بڑھاؤ۔ پراپرٹی ٹیکس دس گنا بڑھ چکا ہے 152 روپے میں کون سا مکان ملے گا۔ جنگل میں بھی اگر کوئی جھونپڑا ڈالے گا تو جنگل میں آنے جانے پر کتنا کرایہ صرف ہوگا۔ جبکہ منی بس کا کم سے کم کرایہ اب پانچ روپے ہے حکومت اپنے سرکاری ملازمین کو اتنی کم تنخواہ اور الاؤنس دیکر کیسے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ رشوت نہ لے۔ بڑے بڑے افسران کو گھر، ملازمین، سرکاری کھانا مفت ملتا ہے۔ کم از کم دو گاڑیاں، پیٹرول، ڈرائیور الگ ملتے ہیں۔ ٹھیک ٹھاک تنخواہیں ملنے کے باوجود وہ جتنا بڑا افسر ہوگا۔ ماسوائے چند ایماندار افسران کے سب کے سب رشوت لیتے ہیں۔ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزارتے ہیں۔ گریڈ 1 سے 9 تک کے ملازمین کی کوئی سنوائی نہیں ہوتی۔ اس کی بھی خواہشات ہیں۔ اس کے آگے بھی اولادیں جوان ہوچکی ہیں کبھی سو روپے کا اضافہ ہوتا ہے تو مہنگائی 500 روپے کی ہوچکی ہوتی ہے۔ موجودہ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے 100 ارب روپیہ وصول کرلیا ہے۔ بتائیں کہ وہ روپیہ کہاں ہے۔ عوام کو کیا ملا۔ ٹرانسپورٹرز ہڑتال کررہے ہیں۔ آمد و رفت دن بدن مہنگی ہوتی جارہی ہے۔ ڈاؤن سائزنگ کی وجہ سے بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ خودکشی روزمرہ کا معمول ہے ان صاحب کا کہنا تھا کبھی کبھی دل کرتا ہے کہ وہ خودکشی کرلیں مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس حکومت سے لوگوں کو بڑی امیدیں

وابستہ تھیں مگر ناامیدی کے سوا حکومت نے عوام کی بہتری کے لئے کچھ نہیں دیا اور نہ ہی آگے کوئی خوشخبری کی توقع کی جاسکتی ہے۔ عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، کاروبار ٹھپ ہو چکا ہے۔ اس سال عید کے موقع پر لوگ زیادہ تر دام ہی پوچھتے دیکھے گئے۔ ہمیں کشمیریوں کی تو فکر ہے مگر خود ہمارے عوام غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ وہ ہم کو نظر نہیں آتا۔ جب اسمبلیاں بحال تھیں تو کم از کم عوام کی آواز بلند ایوانوں میں سنائی دیتی تھی۔ مگر آج عوامی نمائندے گھر بیٹھے ہیں۔ ان کو اپنی حکومت جانے کا غم ہے۔ عوام کی کسی کو فکر نہیں ہے۔ روزگار کی تلاش میں جائز و ناجائز ذرائع سے لوگ باہر جا رہے ہیں۔ بیرون ملک ہمارا پاسپورٹ تین تین بار الٹا کر دیکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات آدھا گھنٹہ سوال و جواب میں گزر جاتا ہے۔ سب ہم کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ملک سے جانے والے ہر جہاز پر کتے چھوڑے جاتے ہیں۔ حالانکہ خود امریکہ اور یورپ میں ڈرگ کا سب سے بڑا نیٹ ورک (Network) ہے وہاں کی مافیا پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ہم چونکہ غریب ملک سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا سارا زور ہم پر ہر کوئی ڈال رہا ہے۔ ہندوستان نے ہم سے پہلے ایٹمی دھماکہ کیا۔ اس کو کسی نے دھمکی نہیں دی۔ ہم نے دھماکہ کیا تو ہم پر روز نئی پابندیاں لگ رہی ہیں۔ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک نئے قرضے دیتے ہوئے ہماری بے عزتی کرنے سے نہیں چوکتے۔ اب تو انہوں نے اسٹیٹ بینک کی ایک منزل پر اپنا دفتر بھی قائم کر لیا ہے بلکہ ہمارے قومی معاملات میں بھی وہ مداخلت کرنے سے باز نہیں آتے۔ اپنے ملک میں وہ عوام کی خدمت کرتے ہیں اور ہمارے ملک میں وہ عوام پر ٹیکس پر ٹیکس لگانے، بجلی، پیٹرول کی قیمتیں بڑھانے پر زور دیتے ہیں تاکہ ہم ان سے سستا مال نہیں بنا سکیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ سے ہم کو باہر نکالا جا رہا ہے مسلمانوں کو بالعموم اور پاکستانیوں کو بالخصوص دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے اسرائیل فلسطینیوں پر گولیاں برسا رہا ہے۔ خود اسرائیل کے عوام نے اس اپنی ہی حکومت کے ظلم کے خلاف مظاہرہ کر کے کہا ہے کہ ہم امن چاہتے ہیں۔ کب تک جنگ کرتے رہیں گے۔ امریکہ خود اس کو ہتھیار مہیا کر رہا ہے۔ اسرائیل ہندوستان کو جنگی ٹریننگ دے رہا ہے یورپ بھی خاموش ہے۔ کوئی اس کو دہشت گرد نہیں کہتا۔ اگر تمام مسلمان ممالک ایک ہو جائیں تو کس کی مجال ہے جو ہماری طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔

02nd February, 2001

دوہری پریشانی

آج کل پھر ملک بھر میں گاڑیوں کے چھیننے کی وارداتوں میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف کراچی میں 16 سے 20 گاڑیاں اور 20 سے 25 موٹر سائیکلیں روزانہ چھینی جا رہی ہیں۔ اگرچہ پولیس کے ذرائع کا کہنا ہے کہ موجودہ حکومت کے آنے سے ان وارداتوں میں بہت کمی ہو چکی ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے، البتہ جب یہ حکومت برسر اقتدار آئی تھی تو بے شک چند ہفتے عافیت کے ضرور گزرے تھے مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا حالات پھر سے پرانی نہج پر جاتے گئے اور اب تو دن دہاڑے گن پوائنٹ پر گاڑیاں چھیننا فیشن بنتا جا رہا ہے اور سب سے زیادہ وارداتیں کراچی میں ہوتی ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ کراچی کے لوگ زیادہ تر گاڑیاں انشورڈ کرواتے ہیں لہٰذا وہ مزاحمت نہیں کرتے۔ اس طرح گاڑی باآسانی چھینی جاتی ہے۔ دوسری وجہ کراچی کے لوگ ڈرپوک بھی ہیں کیونکہ دیگر صوبوں کی بہ نسبت ان کے پاس اسلحہ بھی نہیں ہوتا۔

میرے بہت سے دوستوں نے خاص طور پر میری توجہ اس اذیت ناک صورت حال پر مبذول کروائی جو روزمرہ کا معمول بنتی جا رہی ہے۔ پولیس اس میں بے بس ہو چکی ہے۔ اگر کسی سے گاڑی چھینی جائے تو انہوں نے ایسے ایسے تکلیف دہ مراحل بتائے جس سے بڑی حیرانگی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جس کی گاڑی چھینی جائے تو پولیس رپورٹ میں چھیننے کے بجائے چوری کی واردات لکھانے کی کوشش کرتی ہے تاکہ علاقہ پولیس کی کارکردگی پر برا اثر نہ پڑے۔ لوگوں نے بتایا پہلے تو پولیس FIR لکھنے کے بجائے صرف روزنامچے میں اندراج پر ہی اصرار کرتی تھی مگر اب FIR تو لکھ لیتی ہے مگر ڈکیتی یا چھیننے کے بجائے چوری یا گمشدگی کی FIR لکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ پولیس کا رویہ پہلے سے بہت بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ FIR کے لئے گھنٹوں نہیں بیٹھنا

پڑتا ہے، فوراً مستعدی بھی دکھائی جاتی ہے۔ جائے واردات پر بھی انچارج پہنچ کر معائنہ کرتے ہیں۔ پھر CPLC کے دفتر میں لے جا کر مختلف ڈکیت کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ مگر میں حیران ہوں کہ کراچی کے ہر ہر کونے میں ٹریفک پولیس معہ وائرلیس کے موجود ہوتی ہے CPLC فوراً تمام تھانوں کو بروقت اطلاع بھی کر دیتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ گاڑی فوراً کیوں نہیں پکڑی جاتی۔ آخر گاڑی ان ہی کے سامنے سے تو گزرے گی کوئی ہوائی جہاز تو نہیں کہ اڑ کر پہنچ جائے شاذ و نادر ہی پولیس نے بروقت کارروائی کر کے گاڑی پکڑی ہو۔ البتہ جو گاڑیاں صرف ڈکیتی کی نیت سے چھینی جاتی ہیں۔ وہ البتہ ایک آدھ دن میں کسی سنسان علاقے میں کھڑی مل جاتی ہیں جس کو پولیس اپنی کارکردگی کے کھاتے میں ڈال کر تھانے لے آتی ہے۔ پھر اس کا معائنہ ہوتا ہے کہ جو ڈکیت قیمتی سامان نکال کر لے گئے ہوں تو اب اور کیا سامان نکالا جا سکتا ہے۔ تاکہ سارا چوری کا الزام ڈکیت ہی پر ڈالا جا سکے۔ اگر خوش قسمتی سے گاڑی برآمد ہو جائے تو اس کی واپسی کا مرحلہ انتہائی پیچیدہ اور تکلیف دہ ہے۔ پہلے سارے کاغذات لائیے پھر پولیس کے عملہ سے تعاون کیجئے تاکہ وہ کورٹ کی کارروائی آسان بنا سکے۔ پھر دنوں کورٹ کے چکر لگائیے ان کے غیر ضروری کاغذات کا پیٹ بھریئے۔ تب جا کر گاڑی کے ریلیز کے کاغذات بنیں گے۔ پھر واپس پولیس کارروائی اور تھانے سے گاڑی کی رہائی نصیب ہوگی۔ اب آپ کی قسمت پر منحصر ہے کہ آپ کا کتنا قیمتی سامان غائب ہو چکا ہے کہ اس پر بھی بس نہیں ہے۔ آپ کو ایک سال کا ضمانتی بونڈ بھرنا پڑے گا کہ آپ اس گاڑی کو ایک سال تک نہیں بیچ سکتے۔ اگر اس کا کوئی اور دعویدار آ گیا اس کو بھی آپ نے نمٹنا ہے کہ آپ کی گاڑی کے اصلی کاغذات بھی عدالت کے حتمی فیصلے تک کورٹ میں جمع رہیں گے۔ آپ ہر پیشی پر اسی طرح حاضر ہوتے رہیں گے۔ اگر پولیس نے خدانخواستہ کوئی ملتا جلتا ڈکیت پکڑ لیا تو آ پکو تھانے آ کر اس کو شناخت کرنا پڑے گا وغیرہ وغیرہ۔ گویا اگر آپ کی گاڑی مل بھی جائے تو کم از کم ایک سال تک آپ اسی کرب و عذاب میں مبتلا رہیں گے اور دعا کریں گے یا اللہ وہ اصلی ڈکیت نہ پکڑا جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ اگر آپ شناخت کر لیں تو ڈکیت کے ساتھیوں کی طرف سے جان سے مارنے کی دھمکیاں الگ ملیں گی۔ میرے بہت سے واقف کاروں نے بتایا کہ ہم دعا کرتے ہیں کہ گاڑی نہ ملے تو بہتر ہے۔ کیونکہ ہم انشورنس سے کلیم لے کر جان چھڑانا بہتر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ انشورنس والے بھی 90 دن سے پہلے کلیم کی ادائیگی نہیں کرتے۔

میری حکومت سے استدعا ہے کہ یہ تکلیف دہ مراحل ختم کر کے پہلے کی طرح ہی پولیس افسران کاغذات چیک کر کے گاڑی اصل مالک کو واپس کیوں نہیں کر دیتے۔ اتنے لمبے Procedure کو ختم کر کے آسان طریقے سے جس طرح دیگر ممالک میں ہوتا ہے کہ گاڑی کے اصلی کاغذات اور مالک کے شناختی کارڈ دیکھ کر گاڑی فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ ایک تو وہ بے چارہ گاڑی سے محروم ہوتا ہے۔ آنے جانے کی پریشانی الگ ہوتی ہے کہ جبکہ خود اس کی اپنی گاڑی تھانے میں کھڑی بیکار زنگ کھا رہی ہوتی ہے۔ جس میں سے مزید سامان کی چوری کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے ہر دلعزیز وزیر داخلہ معین الدین حیدر صاحب اس کو حل کرنے میں ضرور عوام کی مدد فرمائیں گے اور اس غیر ضروری اور پیچیدہ مراحل کو ختم کر کے عوام کو اس سے نجات دلوائیں گے اور ہمارے آئی جی پولیس، کمشنر کراچی بھی اس مسئلہ کو حل کرانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

09th February, 2001

قارئین کے اعتراضات

دو ہفتے قبل میں نے ایک کالم بعنوان ''اوپر کا بٹن'' لکھا تھا جس میں میں نے دعوت ولیمہ میں ون ڈش یا زیادہ کھانوں پر سے پابندی اٹھانے پر دلائل دیئے تھے کہ اس سے نہ تو معیشت پر بوجھ بڑھ رہا تھا اور نہ ہی قیمتوں میں اشیائے طعام پر کمی کا رجحان تھا۔ کیونکہ اصل اخراجات کھانے پر نہیں بلکہ جہیز جیسی فضول رسومات نئے نئے اور مہنگے ملبوسات، جیولری اور مہنگے تحائف کی وجہ سے شادی کے بجٹ پر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا ساتھ ساتھ اس قانون پر دن بدن عمل کم ہو رہا تھا۔ البتہ انتظامیہ اور مقامی پولیس کے نام بھتہ شروع ہو چکا تھا۔ مگر میرے بیشتر قارئین نے میرے دلائل سے اتفاق نہیں کیا اور مجھے بہت سے خطوط ملے اور میرے اپنے دوستوں نے بھی دعوت ولیمہ پر کھانے کی پابندی پر اصرار کیا۔ چند خطوط تحریر کر رہا ہوں تا کہ میرے قارئین مطمئن ہو سکیں۔

کراچی لانڈھی سے عرفان احمد خان صاحب لکھتے ہیں۔ آپ نے ولیمہ کی دعوت کے حق میں لکھ کر ہم غریبوں کا بھرم کھولا ہے حکومت نے اس لئے پابندی لگائی تھی کہ ہم جیسے غریب جو کھانوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے ان کو قانونی تحفظ مل جائے گا اور کسی کو ہم پر کھانے کے بہانے انگلی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ کچھ نہ کچھ تو ہمارا بوجھ ہلکا ہوگا مگر آپ نے امیروں کا نقطہ نظر ہم پر مسلط کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ کھانے پر سے ہرگز ہرگز پابندی نہیں اٹھانی چاہئے بلکہ انتظامیہ کو پابند کیا جائے جو اس کی خلاف ورزی کرے۔ اس کو کڑی سزا ملنی چاہئے تا کہ معاشرہ میں سادگی آئے اور غریب مہنگائی اور غیر ضروری رسومات سے بچ سکے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ہم غریبوں کا نقطہ نظر ضرور شائع کریں گے۔ حیدر آباد سندھ سے پروفیسر رؤف میمن نے بھی بہت اظہار ناراضگی کے انداز میں لکھا ہے کہ حکومت اگر کوئی اچھا اقدام کرنا بھی چاہے تو آپ جیسے لوگ اس کو ناکام بنانے کے لئے

کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام رسومات کو ختم کرنے کے لئے آیا تھا جس کی بنیاد سادگی تھی۔ ہم نے ہندو کلچر کو اپنانا شروع کیا۔ امیر لوگ کیا جانیں غریب کی بیٹی اور بیٹا کس کس مراحل سے گزر کر شادی کرتے ہیں اور شادی کے فوراً بعد ان قرضوں میں بری طرح جکڑ جاتے ہیں کہ زندگی شادی کے بعد خوشیوں کی طرف جانے کے بجائے قرض داروں کے طعنوں کی وجہ سے یہ نو بیاہتا جوڑے عذاب کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حکومت کو چاہئے تمام رسومات جس میں جہیز، شادی کے کھانوں، زیورات کی نمائش وغیرہ وغیرہ۔ سب کو سختی سے ختم کرے اور اس پر عمل درآمد کو ترجیحی بنیاد پر شروع کرے اور جو بھی ان پر اعتراض کرے یا ناکام بنانے کی کوشش کرے۔ اس پر سختی سے عمل کرایا جائے اور تمام لوگوں کو خواہ وہ امیر ہوں یا غریب ہوں خود ان کے گھروں پر بھی پابندی لگائے۔ یہ کیسا قانون ہے جو امیروں کو غریبوں کا مذاق اڑانے کی اجازت دے۔

کراچی ہی سے محمود احمد محمود لکھتے ہیں۔ بہت دن بعد تو کراچی کی انتظامیہ نے صرف ایک رات میں کھانوں پر پابندی والے قانون پر عمل کروا کر دوسرے علاقے کے لوگوں کے لئے راستہ ہموار کیا تھا۔ جو قابل ستائش تھا مگر آپ نے ان کی کوششوں کو سراہنے کی بجائے ان پر تنقید کر کے اچھا نہیں کیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کراچی میں تمام شادی ہال بک ہو چکے تھے جن پر کھلے عام کھانے کھلائے جا رہے تھے۔ پابندی کے نام پر دس دس ہزار روپے اضافی رقم انتظامیہ کے نام پر ہم غریبوں سے وصول کی جا رہی تھیں۔ امیر لوگ تو اپنے اپنے محلوں میں دعوتیں اڑا رہے تھے۔ شادی ہال والے روز روز منہ مانگے داموں میں ہال بک کر رہے تھے۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں تھا۔ غریب لڑکیوں کے والدین اگر دو سو کا ہال بک کرواتے تو اس میں چار چار سو افراد آ جاتے تھے۔ کھانا کم پڑ جاتا تھا۔ بے عزتی الگ ہوتی تھی۔ خدا کے لئے کوئی تو اچھا کام کرنے دیں۔ آپ لگتا ہے کیٹرنگ اور شادی ہال والوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہ کوئی اچھی تجویز نہیں ہے کہ آپ نے پہلی مرتبہ ایک متنازعہ کالم لکھا ہے۔ آپ خود سادگی کی تجاویز دیتے رہے ہیں۔ اب آپ کو کیا ہو گیا ہے۔

نئے سکھر سے احمد عبداللہ حاکوانی نے بھی کھانوں پر سے پابندی پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ غربت کے خاتمے کے لئے امیروں پر پابندی کے علاوہ انہیں چاہئے کہ شادی کے موقع پر فلاحی اداروں کی مدد کریں تا کہ غریب والدین اپنی لڑکیوں کی شادیاں کروا سکیں۔ جو ان فضول رسومات کے نام پر بوڑھی ہو رہی ہیں۔ کب تک ہم قرض لے کر غیر ضروری خواہشات کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔ امیر لوگ تو ہم غریبوں کو ڈیکوریشن

پیس سمجھ کر بلاتے ہیں تا کہ ان کی محفلیں ہم سجائیں اور خود وہ اپنے غریب رشتہ داروں کی شادی میں نہیں جاتے بلکہ اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔

کم از کم کھانوں پر سے پابندی سے کھانوں کا زیاں رک گیا تھا۔ رات دو دو بجے تک رخصتی ہوتی تھی جو عام حالات میں دس سے گیارہ بجے تک ہو جاتی تھی۔ غریب اپنی بیگمات کے نئے نئے جوڑوں کی فرمائش سے تنگ آ چکے تھے۔ اگر کھانوں پر پابندی ہو تو کم لوگ شریک ہوتے ہیں اور جلدی رخصتی ہوتی ہے لہٰذا اس قانون میں کوئی رعایت نہیں ہونی چاہئے بلکہ اس کا دائرہ کار بڑھا کر جہیز اور دوسری رسومات پر بھی پابندی لگانی چاہئے تا کہ ہم دوسری مہذب قوموں کی طرح امیر اور غریب کے فرق کو ختم کر کے سادگی کی طرف آ سکیں۔

میرے محترم قارئین اگر آپ غور سے میرے مضمون کو دوبارہ پڑھیں تو جو آپ نے اوپر اعتراضات کئے ہیں۔ میں نے خود ان پر تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا اگر اس قانون پر عمل درآمد نہیں کروا سکتے تو یہ قانون ختم کر دیں۔ میری خود کی تجویز یہی تھی کہ جب اشیائے خورد و نوش میں فرق نہیں پڑتا۔ سادگی پر کوئی عمل خود حکمران نہیں کر رہے امراء کو کھانوں کی پابندی نہیں ہے تو غریب پر یہ پابندی کیوں ہے۔ پابندی دونوں پر یکساں طور پر لاگو کی جائے اور سختی سے اس پر عمل درآمد بھی کروایا جائے تا کہ سادگی ہمارے معاشرے کا حصہ بنے۔ مجھے آپ حضرات کی تجویزوں سے پورا پورا اتفاق ہے۔ (خ۔ا۔ن)

16th February, 2001

سلی کوئسچن (بیوقوفی کا سوال)

بھارت کے ایک چیف آف اسٹاف فیلڈ مارشل مانک شاہ سے ایک صحافی نے انٹرویو کے لئے وقت مانگا کئی دن تک مانک شاہ اس صحافی کو ٹالتا رہا۔ کیونکہ وہ بہت بڑے اخبار کا رپورٹر تھا۔ اس لئے وہ صاف انکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صحافی چونکہ غیر ملک کے اخبار کا رپورٹر تھا اور وہ آیا ہی بھارتی سیاست دانوں اور چند دیگر افراد جن میں مانک شاہ بھی شامل تھا۔ انٹرویو لئے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا۔ تمام سیاست دانوں اور دیگر افراد تو پہلے ہی فون میں ٹائم دیتے رہے اور وہ انٹرویو لیتا گیا مگر مانک شاہ جان بوجھ کر گریز (Avoid) کرتا رہا۔ مگر رپورٹر نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ آخر کار ایک دن مانک شاہ انکار کرتے کرتے تھک گیا اور اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ صحافی انٹرویو لئے بغیر بھارت سے نہیں جائے گا تو اس نے کہا اچھا اگر تم کو انٹرویو چاہئے تو فلاں دن فلاں وقت دہلی ایئرپورٹ پر آ جانا مجھے اپنے ایک سرکاری مہمان کو الوداع (See off) کرنا ہے۔ واپسی میں تم میری ہی گاڑی میں جاؤ گے۔ جتنا وقت ایئرپورٹ سے میرے دفتر تک آنے میں لگے گا صرف اتنے ہی وقت میں تم کو اپنا انٹرویو مکمل کرنا پڑے گا۔ اس سے ایک منٹ نہ کم نہ زیادہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔

رپورٹر نے بہت کہا کہ چلتی گاڑی میں انٹرویو میں یکسانیت اور تسلسل نہیں رہتا۔ لہٰذا اتنا ہی ٹائم وہ اپنے دفتر میں دے دیں۔ مگر مانک شاہ نے صاف انکار کر دیا۔ دفتر کے ٹائم کی قیمت مجھے سرکار کی طرف سے ملتی ہے۔ لہٰذا سرکار کا ٹائم میں تمہیں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اول تو میں فوجی آدمی ہوں۔ میں انٹرویو نہیں دیتا چونکہ تم نے اصرار کیا ہے اور میرے تمام انٹرویو نہ دینے کے دلائل بھی ختم ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اگر تمہیں انٹرویو لینا ہے تو میرے پاس صرف ایئرپورٹ سے دفتر تک کا ہو سکتا ہے۔ رپورٹر نے آخری حربہ استعمال کیا اچھا گھر کا کوئی وقت چھٹی کے بعد کا ہی دے دیں۔ اس نے کہا کہ میں گھریلو زندگی میں خلل نہیں ڈالتا۔ بولو تم کو منظور ہے

یا میں فون بند کردوں۔ رپورٹر آخر کار مان گیا اور مقررہ دن اور وقت پر ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ مانک شاہ نے اپنے سرکاری مہمان کو الوداع کر کے رپورٹر کو اپنی جیپ جو سامنے کھڑی تھی اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ڈرائیور والی سیٹ پر بیٹھ کر جیپ اسٹارٹ کر کے ایئر پورٹ سے روانہ ہو گیا۔

رپورٹر کو بڑا تعجب ہوا کہ اتنے بڑے ملک کا سی این سی اور نہ ڈرائیور نہ آگے پیچھے ہوٹر۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ مگر اس کو اپنی آنکھوں پر یقین کرنا پڑا۔ مانک شاہ نے رپورٹر کو کہا کہ جو پوچھنا ہے جلدی کرو۔ راستہ بھر رپورٹر طرح طرح کے سوالات کرتا رہا۔ مانک شاہ اس کو دھیمے انداز میں جیپ چلاتے ہوئے جوابات دیتا رہا۔ رپورٹر بھی بہت ہوشیار تھا اس نے گھما گھما کر سوالات کئے مگر مانک شاہ خندہ پیشانی سے اس کے جوابات دیتا گیا۔ مگر جب بھی رپورٹر اس کو سیاست میں مداخلت اور عوام سے دور رہنے کی وجہ پوچھتا تو مانک شاہ کا ایک ہی جواب ہوتا وہ یہ کہ ہمارا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے، ہمارا سیاست سے کیا کام یہ سیاست دانوں کا کام ہے۔ کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا۔ رپورٹر اس سے کوئی ایسا جملہ نکلوالے گا جس سے اس کے انٹرویو میں جان پڑ جائے۔ مگر مانک شاہ اس کو لاجواب کئے رہا۔ جب دفتر قریب آنے لگا تو مانک شاہ نے رپورٹر کو کہا اب میرے دفتر آنے میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔ اب صرف آخری سوال پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔ رپورٹر نے پوچھا۔ آپ اتنے بڑے جرنیل ہیں آپ خود گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا۔ کوئی آپ کو جان سے نہ مار دے۔

مانک شاہ پہلے ہنسا پھر کہنے لگا یہ کیا سلی کوئسچن (Silly Question) کر دیا۔ تم نے میرا سارا موڈ خراب کر دیا اور پھر بولا ہم قوم کی حفاظت کے لئے ہیں۔ جس دن ہم کو خود اپنی حفاظت کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو ہم کو اپنی وردی اتار دینی چاہئے۔ کیونکہ رکھوالے کو اپنی حفاظت کے لئے دوسرا رکھوالا نہیں چاہئے۔ بھلا چوکیدار کو بھی چوکیدار کی ضرورت ہے۔

اتنے میں گاڑی سرکاری گیٹ پر پہنچی۔ سلوٹ کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئی۔ مانک شاہ نے جیپ کے اسٹینڈ پر جیپ ترتیب سے کھڑی کی۔ رپورٹر سے ہاتھ ملایا۔ بائے بائے کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف اکیلے ہی بڑھ گیا۔ رپورٹر ہکا بکا اس کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ یاد رہے مانک شاہ ایک پارسی فوجی تھا۔

یہ واقعہ آج سے پچیس سال پہلے سنایا تھا۔ آج میں شاہراہ فیصل پر خود اپنی گاڑی چلا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک پولیس موبائل مسلسل ہارن بجا کر اوورٹیک کرنا چاہتی تھی۔ میں اپنی لین میں مقررہ رفتار سے گاڑی چلا رہا

تھا۔ میرے برابر والی لین خالی تھی۔ قانون کے مطابق اگر آپ کو اوورٹیک کرنا ہو تو آپ برابر کی لین خالی ہو تو اوورٹیک کر لیتے ہیں۔ جب مسلسل ہارن بجتا رہا تو میں نے اپنے آئینہ سے دیکھا۔ پولیس موبائل والا کہیں میری گاڑی کو ٹکر نہ مار دے۔ میں نے برابر والی خالی لین کی طرف گاڑی کر لی۔ بڑی تیزی سے موبائل نے مجھے کراس کیا۔ جس میں پولیس والا گن لئے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے بری طرح گھورا۔ پھر دوسری جیپ میرے پاس سے گزری۔ اس میں ایک وردی میں ایس ایس پی صاحب بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی مجھے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں تمہیں نہیں معلوم ہم اس علاقہ کے ایس ایس پی ہیں۔ جیپ پر بھی گورنمنٹ سندھ کی ایس ایس پی والی نمبر پلیٹ تھی۔ اس جیپ کے پیچھے بھی ایک اور پولیس موبائل تھی۔ اس میں بھی پولیس والے بھرے تھے اور ایک پولیس والا گن سنبھالے کھڑا تھا۔ جب یہ قافلہ مجھے اوورٹیک کر گیا تو مجھے یکا یک وہ مانک شاہ کے الفاظ یاد آ گئے۔ اگر قوم کے محافظ کو خود اپنی حفاظت کی ضرورت پڑ جائے تو ہم کو اپنی وردی اتار دینی چاہئے۔ میں گاڑی چلاتے ہوئے سوچ رہا تھا اب عوام کی حفاظت کون کرے گا جب پولیس والے خود اپنے پولیس والوں کی حفاظت میں لگے ہوئے ہوں اور عوام سے راستہ صاف کروا کر اپنے ہی افسر کو اس کی منزل تک پہنچا رہے ہوں اور وہ ایک باوردی افسر بڑے رعب کے ساتھ راستہ نہ دینے والے شہری کو دوسرے درجے کا شہری سمجھے جبکہ وہ اسی شہری کے ٹیکس دینے کی وجہ سے اس کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن بھی ہے۔ اس کا جواب مجھے کون دے گا۔

24th February, 2001

بڑے بول کا انجام

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور وہی مالک الملک ہے۔ جب کسی نے اس کی بڑائی کو چیلنج کیا وہ تباہ و برباد ہوا۔ ماضی کی چند مثالیں ہیں۔ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا اس کا حشر تاریخ کا حصہ بن گیا۔ ماضی کی صدی میں بھی چند مثالیں آنے والی صدی کے لئے تاریخ کا حصہ ثابت ہوں گی۔ بشرطیکہ ہمارے سیاست دان اور جن ممالک کے بارے میں میں نے لکھا ہے وہ سمجھیں بڑا بول ہمیشہ پستی کی طرف ہی لے کر جاتا ہے۔ سب سے پہلے سلطنت برطانیہ کو ایک زمانے میں گریٹ بریٹن (Great Britain) یعنی عظیم برطانیہ کہا جاتا تھا۔ خود ان کی زبان میں سلطنت برطانیہ میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ یعنی اتنی بڑی سلطنت یورپ سے لے کر ایشیاء، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، خلیج مشرق بعید یعنی ہر طرف برطانیہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ گریٹ بریٹن سکڑ کر صرف انگلینڈ تک محدود رہ جائے گا۔ تمام مفتوحہ علاقے ایک ایک کر کے آزاد ممالک بن جائیں گے۔ اس انگلستان نے ایک زبردست جنگی جہاز بنایا تھا۔ ان کا دعوی تھا کہ اس جہاز کو کوئی بھی تباہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس جہاز کو اس وقت کے لحاظ سے ہر چیز سے محفوظ رکھا گیا تھا۔ یعنی اس پر بمباری کا بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بحری جہاز کو صرف اس کی چمنی سے تباہ کیا جا سکتا تھا۔ انگریز کو اس جہاز پر ناز تھا۔ مگر ایک معمولی جاپانی سپاہی نے اپنے بدن پر بم باندھ کر اس چمنی میں اتر کر اس کو تباہ کر دیا۔ تمام حکمتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ شہنشاہ ایران کی مثال لیں کوئی سوچ سکتا تھا اتنا مضبوط بادشاہ جس نے اپنی وراثت کے لئے ملکہ ثریا کو طلاق دی اور فرح دیبا سے شادی کی۔ مگر خود اس وارث کو ایران کی بادشاہی تو کجا ایران میں رہنے کی جگہ تک نہیں ملی اور خود شہنشاہ ایران کو مرنے کے بعد دو گز زمین خود اس کے ملک میں نہیں ملی۔ جس کو ایشیاء کا پولیس مین کہا جاتا تھا۔ امریکہ کا سب سے بڑا حلیف ہونے کا دعویٰ بھی عوام کے ریلے میں بہہ گیا۔ دوسرے الفاظ

میں امریکہ بھی اس کو نہیں بچا سکا اس امریکہ کا دوسرا حلیف صدر مارکوس فلپائن کا مضبوط ترین اور مرد آہن سمجھا جاتا تھا مگر جب عوام نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو خود امریکہ نے اس کو تحفظ دینے کے لئے اپنا جہاز فراہم کر دیا۔ جس طرح ایران کے شہنشاہ کو بھی جہاز فراہم کیا تھا۔

33 سال سے انڈونیشیا کے مرد آہن سوہارتو جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ عوام میں بہت مقبول ہیں صرف چند ماہ میں حکومت اپنے دست راست کو حوالے کر کے زندگی کے آخری ایام گزار رہے ہیں۔ بنگلہ دیش میں خود بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمان اپنی ہی فوج کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کا استقبال بنگلہ دیش کی تاریخ میں ان کے بعد آج تک نہیں ہو سکا۔ جب وہ بنگلہ دیش کی سرزمین پر اترے تھے تو ڈھاکہ کی سڑکیں انسانی سروں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور جب ان کو انقلابیوں نے قتل کیا تو 24 گھنٹوں تک ان کی لاشوں کو اٹھانے والا بھی نہیں تھا۔

اتنی تمہید لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں پاکستان کی سیاست سے بھی تھوڑا سا سبق حاصل ہونا چاہئے جب قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے یہ دعویٰ کیا کہ میری کرسی بہت مضبوط ہے۔ چند ہی ماہ میں اللہ نے اس دعویٰ کو ختم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ صرف اور صرف اللہ کی ذات غیر فانی ہے۔ باقی سب کو ختم ہونا ہے۔ بھلا کوئی سوچ سکتا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو جیسا مضبوط اور عقلمند سیاست دان بھی اتنی جلدی نہ صرف اپنی حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا بلکہ اپنی جان سے بھی جائے گا۔ بڑا بول ہمیشہ تنزلی کی طرف ہی لے کر جاتا ہے۔

ضیاء الحق اگرچہ ہمیشہ انکساری دکھاتے تھے مگر اندرونی طور پر وہ نہیں تھے جو اپنے آپ کو پیش کرتے تھے۔ ان کی تمام سیاست پی پی پی کو ختم کرنے میں ہی صرف ہوگئی مگر ان کی زندگی میں جب بے نظیر بھٹو واپس ملک آئیں تو ان کا استقبال بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ اسی وجہ سے جب ضیاء الحق کی موت کے بعد انتخابات ہوئے تو پی پی پی ہی کی حکومت وجود میں آئی یعنی اگر آپ کسی کو غیر حقیقی طریقے سے ختم کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ روس جیسی مضبوط ترین طاقت افغانستان جیسے چھوٹے ملک کو ختم نہیں کر سکی اس کو ختم کرنے کی کوشش میں اپنے ہی ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرا بیٹھی۔ یہ بھی اللہ کی شان تھی کہ ایک طرف روس کی افواج تھیں تو دوسری طرف مسلمانوں کی معمولی فوج تھی غرور کو اللہ نے سرنگوں کرنا تھا۔ روسیوں کے بڑے بڑے دعوے ہوا میں اڑ گئے۔ آج پھر امریکا کو غلط فہمی ہوگئی ہے کہ وہ افغانستان کو ختم کر دے گا۔ انشاء اللہ اس ملک کو اللہ کی نصرت پہلے بھی

حاصل تھی اور آج بھی اللہ اس ملک کو بچائے گا۔ امریکہ ہو یا کوئی بھی طاقت ہو اللہ کی طاقت کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

پھر واپس اپنے ملک کی سیاست کی طرف آتا ہوں نواز شریف حکومت کو بڑا ناز تھا کہ وہ عوام کے بھاری ترین مینڈیٹ کے ساتھ آئی ہے وہ جو چاہیں گے کر گزریں گے۔ مگر ان کے بے لگام وزراء دن رات کرپشن میں لگ گئے۔ خود ان کا خاندان بھی اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھ بیٹھا۔ جس کو چاہا گلے لگا لیا جس کو چاہا رسوا کر کے نکال دیا۔ وہ عدلیہ کا سربراہ ہو یا ملک کا صدر ہو یا فوج کا اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہر شخص صرف اور صرف شریف خاندان کا وفادار ہو اسی رو میں ایک دن ٹی وی پر تقریر کر بیٹھے کہ نواز شریف کو کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ وہ دن ان کا ٹرننگ ڈے تھا۔ اللہ کو یقیناً برا لگنا تھا کہ اس کی ذات کو چیلنج کرنا پھر لوگوں نے دیکھا کہ زوال شروع ہو گیا پھر ایسا زوال اللہ دشمن کو بھی نہ دکھائے کہ آج خود ان کے خاندان سمیت سب کے لئے پاکستان کی سرزمین سکڑ گئی۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ خود ان کے لائے ہوئے چیف آف اسٹاف پر پرانا فارمولا دہرانا اتنا مہنگا ثابت ہوگا کہ ان کو ہٹانے کے بجائے خود جال میں آ پھنسے اور ایسے پھنسے کہ نہ رو سکتے ہیں نہ ہنس سکتے ہیں۔ اپنے ہی ملک میں نہ آ سکتے ہیں نہ جا سکتے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ان کی راتیں کیسے گزرتی ہوں گی۔ دن تو بہرحال کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا ہوگا۔ ہماری موجودہ حکومت بھی اپنی مقبولیت کا گراف نیچے کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو اس کے اپنے مشیر ہیں جو خود بے چارے مجبور اور پاور لیس (Powerless) ہیں۔ لگتا ہے کولھو کے بیل کی طرح ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کا دائرہ بتا دیا گیا ہے۔ جس نے اس دائرے کو کراس کرنے کی کوشش کی اس کی پٹی کھول کر باہر کر دیا گیا پھر اس حکومت کی کوشش بھی یہی ہے کہ کسی طرح پی پی پی اور مسلم لیگ کی حکومت نہ آ سکے۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے جس دن پرویز مشرف صاحب نے تقریر میں کہا کہ فوج مسلم لیگ اور پی پی پی کو اقتدار میں نہیں آنے دے گی جبکہ دوسری طرف وہ ملک کو جمہوریت کی طرف لانا چاہتے ہیں اور سپریم کورٹ کے ٹائم ٹیبل کے مطابق تین سال میں پاکستان دوبارہ جمہوری ملک بن جائے گا۔ مگر کیسے ایک طرف وہ مسلم لیگ کے باغی (ہم خیال) افراد کو جمع کر رہے ہیں تو دوسری طرف بقایا افراد کے خلاف مقدمات بنا رہے ہیں۔ غالباً ان کے مشیر بھی ان کو غلط سمت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ جبکہ وہ خود بھی اس سے متفق نہیں ہوں گے کہ زبردستی کسی کو دبانے سے ان کی غیر جانبداری

بھی متاثر ہوگی۔ ان کی ٹیم پر ابھی تک کوئی بڑا کرپشن کا الزام تو نہیں لگا ہے مگر سیاست کی ٹیسٹ کیپ کے لئے کوالیفائی (Qualify) نہیں کر سکتی۔ بیوروکریسی نے فوج اور عوام کے درمیان اتنا بڑا خلاء پیدا کر دیا ہے جو بھرا نہیں جا سکتا ہر ہفتے ایک نیا فتنہ پیدا کیا جاتا ہے۔ علماء، سیاست دان، تاجر، مزدور، زمیندار، ہاری، صنعت کار کوئی بھی تو خوش نہیں ہے۔ معیشت زوال پذیر ہے۔ اس سے زیادہ میں اور نہیں لکھ سکتا۔ ہم کس سمت کی طرف جا رہے ہیں۔ خدارا میرے عوام کو بتا دیں وہ کب تک مایوسی کی حالت میں رہیں گے۔ کب ان کی صبح ہوگی۔

02nd March, 2001

وزارت حج اور مذہبی امور دو ارب روپے کا حساب دے

عوام کو شاید یہ معلوم بھی نہ ہو کہ سب سے بڑا بجٹ اخراجات کے لحاظ سے ہماری وزارت حج اور مذہبی امور کا ہے جو تقریباً چار ارب روپے کا ہے جو ہر سال تقریباً ایک لاکھ پانچ ہزار حجاج صاحبان سے 6 ماہ قبل درخواست وصول کر کے حجاج کو مکہ اور مدینہ شریف میں ٹھہرایا جاتا ہے باون سال سے صرف قرعہ اندازی میں جانے والے حجاج کرام کو حکومت پاکستان جن کی تعداد نصف ہوتی ہے ان کے لئے رہائش کا بندوبست کرتی تھی۔ ان سے ٹھہرانے کا کرایہ وصول کر کے ایک ایک کمرے میں بیس بیس حجاج کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ میں صرف ان حجاج کرام کا پاکستان سے لے کر حج تک ہونے والی تکالیف کا تجزیہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سب سے پہلے تو ان سے چھ ماہ پہلے ہی سے درخواستیں اور رقم وصول کر لی جاتی ہیں پھر قرعہ اندازی ہوتی ہے یہ تقریباً پچاس ہزار حجاج کرام ہوتے ہیں جن کا فارن ایکسچینج حکومت پاکستان مہیا کرتی ہے۔ ان سے مکہ شریف اور مدینہ شریف کی رہائش کا بندوبست حکومت پاکستان کرتی تھی اور اس کا معاوضہ بھی ان حجاج کرام سے وصول کر لیا جاتا تھا۔ بقایا پچاس ہزار حجاج سیلف فنانسنگ (Self Financing) کے ذریعے حج کرتے تھے وہ تمام فارن کرنسی کا بندوبست خود کرتے تھے۔ وہ رہائش سے مستثنیٰ ہوتے تھے مگر ہماری بیوروکریسی مسلسل موجودہ حکومت کو زک پہنچانے میں کوئی موقع جانے نہیں دیتی۔ اس نے اس سال سعودی حکومت کو مشورہ دیا کہ تمام حجاج کرام جو پاکستان سے جائیں ان کا بندوبست بھی دیگر حجاج کے ساتھ رہائش حکومت پاکستان کرنے کے لئے تیار ہے۔ حکومت سعودیہ کا ہمیشہ یہ نظریہ رہا ہے کہ حجاج کرام کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچایا جائے جبکہ ہماری مذہبی امور اور سفارت پاکستان کا نظریہ یہ رہا ہے کہ کسی طرح اس اربوں روپے کی رقم کو ہضم کیا جائے۔ ایک لاکھ پانچ ہزار افراد کی رہائش پر چار ارب روپے وصول کئے گئے۔ ہر حاجی

سے 1600 ریال مکہ کی رہائش کیلئے وصول کئے گئے۔ عوام نے واویلا کیا مگر ایک لاکھ پانچ ہزر میں سے وزارت حج، حکومت پاکستان نے ستاسی ہزار حجاج کی رہائش کا بندوبست کیا اور ہر ایک سے 1600 ریال بھی ایڈوانس وصول کر لئے۔ بقایا 18 ہزار حجاج نے اپنے اپنے گروپوں کے ذریعے رہائش حاصل کی۔ ان گروپوں کے مطابق ان کے حجاج صرف پانچ منٹ کی دوری میں رہائش پذیر ہوئے اور 1200 ریال ان کو ادا کرنا پڑے۔ صرف 507 افراد کو رہائش سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ ان کے حجاج کرام نے بھی حرم سے صرف چند منٹ دوری پر رہائش حاصل کی اور 800 ریال سے ایک ہزار ریال ادا کئے مگر ہماری مذہبی امور اور سفارت پاکستان جدہ نے ستاسی ہزار حجاج کا بندوبست دو کلومیٹر کے اندر کیا۔ دو کلومیٹر کا فاصلہ اور سعودی موسم سے ہر نماز کے لئے آنا جانا کس قدر تکلیف دہ ہو سکتا ہے وہ صرف حجاج کرام ہی جان سکتے ہیں۔ بھلا اللہ کے گھر جانے والوں کو دو کلومیٹر کا تو نام تھا مکہ میں جبل سوڈان، جبل حبشہ اور نہ جانے کس کس جبل پرستی رہائش خرید کر ان حجاج کرام کو ٹھہرا دیا گیا۔ ان ستاسی ہزار حجاج کرام کا فی کس 800 ریال سے 1200 ریال ہضم کر لیا گیا۔ کیونکہ ان دور پڑے علاقے میں صرف چند سو ریال میں رہائش مل جاتی ہے اس طرح صرف مکہ میں رہائش میں ڈیڑھ ارب روپیہ بنتا ہے پھر آپ مدینہ میں رہائش کا حساب کریں ایک بلڈنگ تو اتنی دور لی گئی جس میں ہزاروں حجاج کرام بری طرح بھر دیئے گئے اور کروڑوں کا گھپلا کیا گیا۔ تقریباً دو ارب روپے با آسانی ہڑپ کر لئے اس میں کس کس کا ہاتھ ہے۔ یہ حکومت پاکستان کی بدنامی اور حجاج کرام سے زیادتی کے مترادف ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ جدہ کے حج ڈائریکٹر اور جوائنٹ سیکریٹری اس کھیل میں بالکل شامل نہیں رہے بلکہ وہ تو کف افسوس ملتے رہے۔ اس پر ہی بس نہیں کیا گیا بلکہ اس سال تقریباً پانچ ہزار درخواستیں کم وصول ہوئی تھیں۔ سعودی حکومت نے آخری دنوں میں وزارت مذہبی امور کو اجازت دی۔ اگر اب بھی کوئی جانا چاہے تو وہ انٹر نیشنل پاسپورٹ پر حج کے لئے جا سکتا ہے بشرطیکہ ہماری وزارت حج اس کو این او سی جاری کر دے۔ ہمارے سیکریٹری صاحب نے فرمان جاری کر دیا۔ جس کو جانا ہے وہ درخواست لے کر اسلام آباد آ جائے بھلا اس میں بلانے کی کیا تک تھی۔ بعد میں سمجھ میں آئی، ٹریول ایجنٹ، وزارت کے ٹاؤٹوں نے تین ہزار سے لے کر دس ہزار تک رشوت لے کر آخر کے 1500 حجاج کو این او سی جاری کئے۔ دو دو مرتبہ اسلام آباد بلایا گیا۔ ایک موقع پر سیکریٹری صاحب نے 13 فروری کو اعلان کیا کہ کراچی اور لاہور کے حجاج کرام واپس چلے جائیں۔ 19

فروری تک ان کے پاسپورٹ کراچی کے حاجی کیمپ میں این او سی کے ساتھ واپس کر دیئے جائیں گے۔ مگر جب 22 فروری تک یہ پاسپورٹ کراچی حاجی کیمپ میں نہیں پہنچے تو یہ حجاج کرام دوبارہ اسلام آباد آئے اور ان کے دوبارہ آٹھ ہزار روپے آنے جانے میں لگ گئے۔ تب جا کر ان کے پاسپورٹ اور این او سی (NOC) ملے مگر ان کو بھی ''مک مکا'' کرنا پڑا اور جنہوں نے حج کے لئے رشوت دینا توہین سمجھا ان تین سو افراد کو این او سی دیا ہی نہیں گیا اور اس سال حج سے محروم ہو گئے بعد میں پتہ لگا ہمارے سیکریٹری صاحب خود عازم جدہ ہو گئے۔ یقیناً ان کی نوکری کا آخری سال تھا۔ تمام زندگی میں ایسا سنہری موقع کیسے مل سکتا تھا۔ اب کون پوچھے کہ ہمارے قونصل جنرل جو رہائش گاہیں خریدنے کے مجاز ہیں۔ ہمارے وزیر مذہبی امور کی اجازت اور سیکریٹری کی پسند کی عمارتوں میں حصہ کے بغیر کیسے خرید سکتے تھے۔ یہ کھیل ازل سے جاری تھا۔ کئی کئی قونصل جنرل اور ڈائریکٹر حج ان کے چمچے دس دس سال تک اس وزارت اور سفارت سے چپکے رہے۔ کسی کو اس طرف خیال ہی نہیں آیا کہ کروڑوں کا گھپلا اب اربوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مذہب کی آڑ میں ان حجاج کرام پر کیا گزرتی ہو گی۔ جبکہ کراچی ایئرپورٹ سے روانگی کے وقت سے ہی تکالیف کا آغاز ہوتا ہے انہیں ٹرمینل 2 پر جس میں کوئی سہولت ہی نہیں ہے۔ رات کو سردی دن میں تپش دھوپ میں 6 سے 8 گھنٹے پہلے بلا کر احرام کی حالت میں بھیڑ بکریوں کی طرح جہاز میں چڑھایا جاتا ہے ان کی عزیز و اقارب ہمارے سول ایوی ایشن کے افسران کا ریپارکنگ سے آگے جانے ہی نہیں دیتے وہ بیچارے دھوپ میں کھڑے اپنے پیاروں کو رخصت کرتے ہیں۔ جب عوام نے شور مچایا تو انہی سول ایوی ایشن کے افسران نے کوئی توجہ نہیں دی۔ کیونکہ ان سے جواب طلب کرنے والے اسلام آباد میں رہتے ہیں جبکہ تکلیف کراچی میں ہو رہی تھی۔ بعد میں چند شامیانے انہوں نے کسی تنظیم سے کہہ کر لگوا دیئے اور کریڈیٹ خود لے لیا۔ جب یہی حجاج کرام جدہ ایئرپورٹ پر اتریں گے نہ ہمارا کوئی سفارت کار ہوگا، نہ وزارت حج کا افسر ہوگا۔ اسی طرح ٹوٹی پھوٹی بسیں ان کا انتظار کر رہی ہونگی کیونکہ ان معلموں سے بھی ہماری وزارت مذہبی امور کا ''کھانچہ'' ہے دیگر ممالک کے حجاج اپنے اپنے وقت پر اترتے ہیں اور اچھی اور ایئر کنڈیشنڈ بسوں میں مکہ روانہ ہوتے ہیں۔ ان کا جدہ ایئرپورٹ پر استقبال کرنے کے لئے ان کے رضا کار اور حکام موجود ہوتے ہیں جو ان کے آرام کا بندوبست کرتے ہیں۔ اگر کھانے کا وقت ہوتا ہے تو ان کے لئے کھانا دستیاب ہوتا ہے ہمارے بجٹ سے تو ان حجاج کے نام سے چائے اور ٹھنڈے کے نام پر رقوم

نکلوائی جاتی ہیں مگر کس کی جیب میں جاتی ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ جاتی رہیں گی۔ اس کا کون حساب لے گا۔ ہماری موجودہ حکومت میں نیب کروڑوں کے گھپلے کا حساب کتاب لے رہا ہے ان اربوں روپے کا حساب کو ن چکتائے گا اور کب تک ہمارے حجاج کرام اس طرح اذیت ناک حج کرتے رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن ان کی بددعائیں رنگ لائیں گی کہیں ماضی کی تینوں حکومتوں کو شاید ان ہی کی بددعائیں کھا گئیں کہ ان کا نام لیوا اب کوئی بھی سامنے نہیں آ رہا ہے۔ ایک ہوائی جہاز سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دو ملک بدر ہو گئے۔ قرآن بار بار کہہ رہا ہے کہ ''اے آنکھوں والوں عبرت پکڑو۔ جنہوں نے عبرت نہیں پکڑی ان کا انجام ہمارے سامنے ہے کم از کم ان اللہ کے مہمانوں کو تو تکلیف نہ دو۔ ان کی بددعائیں تو اللہ کیسے رد کرے گا۔ یہ اور کھیل کون روکے گی۔ اور کب ہمارے حجاج کرام آرام دہ حج کر سکیں گے جس طرح دوسرے ممالک کے حجاج ہم سے بھی کم رقم ادا کر کے اتنا ہی سکون اور آرام سے حج کر رہے ہیں۔

09th March, 2001

اسامہ بن لادن کون ہے؟

مجاہدین کی تاریخ لکھی جائے گی تو ایک نام سب سے منفرد نظر آئے گا۔ وہ نام ہے اسامہ بن لادن، سعودی عرب میں پیدا ہونے والا یہ بچہ کس کو معلوم تھا کہ بڑا ہو کر تن تنہا دنیا کی سب سے بڑی اور واحد مضبوط ترین مملکت (سپر پاور) امریکہ سے ٹکر لے گا اور ایک نہیں بلکہ پانچ سال سے امریکی حکومت بشمول سی آئی اے فوجی ادارے سب کے سب اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ دن رات ایک کر دیئے تمام حربے آزما لئے مگر یہ 43 سالہ نوجوان افغانستان میں پانچ سال سے مقیم ہے جس کے دن رات مختلف مقامات پر بسر ہوتے ہیں۔ اسامہ بن لادن نے 1980ء میں مشہور اسلامی اسکالر جناب شیخ عبداللہ اعظم سے ملاقات کی تھی۔ وہ اس کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا اور اس دن سے آج تک وہ صرف اور صرف جہاد میں مصروف ہے۔ اس کا صرف ایک ٹارگٹ ہے۔ وہ امریکہ ہے، جسے وہ سعودی عرب سے باہر نکال کر ہی دم لے گا اور اس نے یہ اعلان بھی کر رکھا ہے کہ جب تک امریکہ سعودی عرب سے اپنی فوجیں نکال باہر نہیں کرے گا وہ امریکی ٹھکانوں پر حملے کرتا رہے گا۔ اس پر الزامات کی بھرمار خود امریکا نے بھی کر رکھی ہے۔ 1993ء میں امریکی ٹریڈ سینٹر نیویارک پر بھی حملے کا الزام ہے۔ جس میں 18 افراد مارے گئے تھے۔ 1995ء میں سعودی عرب کے شہر ریاض میں امریکی فوجی اڈوں پر حملہ بھی اس کے نام لکھا گیا ہے، جس میں 7 امریکی مارے گئے تھے۔ 1996ء میں دہران میں امریکی اڈے پر حملہ بھی اس کے کھاتے میں ڈالا گیا ہے۔ جس میں 20 امریکی فوجی مارے گئے۔ 1998ء میں کینیا، نیروبی اور دارالسلام، تنزانیہ کے حملے میں 224 افراد ہلاک ہوئے تھے جن میں 15 امریکی بھی شامل تھے وہ بھی اس سے ملوث کیا گیا۔ آخری میزائل حملہ امریکی جہاز پر یمن کے شہر طلان میں کیا گیا تھا۔ جس میں جہاز تباہ ہو گیا اور 17 امریکی سپاہی مارے گئے۔ ہر جگہ جہاں بھی

کوئی امریکی مارا جائے کھاتے میں اسامہ بن لادن کا نام ضرور شامل ہوگا۔ اس سے بڑھ کر امریکیوں کی سبکی کیا ہوگی کہ اسامہ بن لادن کی صحیح اطلاع دینے والے کے لئے امریکی حکومت نے 5 ملین ڈالر کا انعام رکھا ہے۔ یعنی ایک شخص کا پتہ بتانے والے کو تیس کروڑ روپے انعام میں دیئے جائیں گے۔ امریکی شہریت الگ اور اس کی حفاظت کا انتظام بھی امریکی حکومت کے ذمہ ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کی جدید ترین ٹیکنالوجی جس میں ایک سوئی بھی نظر آ جاتی ہے۔ ایک زندہ جیتا جاگتا شخص امریکیوں کو کیوں نظر نہیں آتا۔ وہ بھی افغانستان جیسے چھوٹے ملک میں۔ اس کی وجہ اسامہ بن لادن کی حاضر دماغی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حمل کا نظام ہے۔ اس کے ساتھ اس کے ماننے والوں کا اور جانثاروں کا گروہ ہوتا ہے۔ جو راکٹ لانچر اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہوتے ہیں۔ جو آناً فاناً آنے والے بڑے سے بڑے گروہ کو تباہ کرنے میں منٹ نہیں لگاتے۔ اب اسامہ صرف ایک شخص کا نام نہیں رہ گیا ہے۔ بلکہ ایک تنظیم کا نام بن چکا جس کا کام مسلمانوں میں جہاد کی افادیت کو ابھارنا ہے اور ہر ظالم کو اس کی سزا دینا ہے۔ چاہے وہ روسیوں کے مظالم ہوں یا امریکیوں کے، انہیں غلامی سے آزاد کرانے کا نام ہے کہ اس وقت جہاں جہاں جہادی تنظیمیں کام کر رہی ہیں، اسامہ بن لادن کی تنظیم جسے القاعدہ کہا جاتا ہے پوری کی پوری مدد کے لئے موجود ہوتی ہیں۔ تمام دنیا میں نوجوانوں میں جہاد کا جذبہ اسی تنظیم کا کارنامہ ہے۔ جس سے امریکہ کو بڑی تشویش ہے خود امریکہ اسامہ بن لادن پر کھل کر حملہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس میں دوسرے امریکیوں کی جان کا خطرہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ اسامہ بن لادن پر حملہ صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہ سکتا اس کے جواب میں اس کی ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کی مسلمان جہادی تنظیمیں جواب میں امریکی سفارت خانوں کو نشانہ بنائیں گی اور ایک ہی وقت میں ہزاروں امریکیوں کی جان کا خطرہ بڑھ جائے گا۔

لہٰذا وہ ایسا خطرہ مول لینے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ چند سال پہلے 1998ء میں صدر کلنٹن نے افغانستان پر میزائل برسائے تھے جس سے اسامہ بن لادن کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا البتہ معصوم بے گناہ شہری مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اسامہ بن لادن کو اس حملہ سے آگاہ کر دیا گیا تھا اور اس شہر خوست سے دوسرے شہر منتقل ہو گئے تھے۔ جبکہ 24 شہری مارے گئے۔ امریکی حکومت کی بڑی بدنامی بھی ہوئی اور فائدہ بھی کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔

ایک اور عجیب بات اسامہ بن لادن کے بارے میں بتائی جاتی ہے کہ خود انہوں نے اپنے جاسوس اپنے مخبروں کی شکل میں امریکی سی آئی اے کی خدمات کے لئے بھی دے رکھے ہیں۔ بظاہر تو وہ اسامہ کے لئے مخبری کر رہے ہوتے ہیں۔ در پردہ وہ اسامہ کو ہونے والے نئے حملے سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے آج تک اسامہ زندہ ہیں خود افغانستان کی حکومت طالبان بھی ان کی جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں۔ افغانستان نے اقوام متحدہ کی پابندیاں برداشت کر لیں مگر اسامہ بن لادن کو امریکی حکومت کے حوالے کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ کہا ہے کہ اسامہ بن لادن معصوم تھے اسے کسی بھی قیمت پر امریکیوں کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

مسلمان حکومتوں نے امریکی حکومت سے کہا ہے کہ اسامہ بن لادن کو کسی بھی اسلامی ملک کی عدالت میں پیش کر کے ان پر مقدمات چلائے جائیں۔ مگر امریکی حکومت کا اصرار ہے کہ مقدمہ صرف امریکی عدالت میں ہی چلے گا۔ کیونکہ اسامہ بن لادن کے ڈائریکٹ ملوث ہونے کی کوئی شہادت امریکیوں کے پاس نہیں ہے۔ وہ تو خبروں اور واقعات کی روشنی میں اسامہ بن لادن کے ملوث ہونے کے شہادت ہی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ امریکی حکومت صرف ایک شخص سے کیوں اتنی خائف ہے۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور ایک شخص سینکڑوں میل دور بیٹھ کر اگر اپنا ٹارگٹ پورا کر لیتا ہے تو واقعی وہ قابل مبارکباد ہے۔ جبکہ دوسری طرف اس کے آنے جانے رہنے سونے کی آزادی بھی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف امریکہ جس کے پاس ہر قسم کی افرادی طاقت، ٹھوس اسلحہ، ٹیکنالوجی سب موجود ہیں۔ وہ صرف ایک شخص کو قابو کرنے میں ناکام ہو تو اس میں صرف اور صرف اللہ کی شان کا نزول ہے کہ جس کو چاہتا ہے وہ مارتا ہے جس کو چاہتا ہے زندہ رکھتا ہے۔ سب چیزوں پر وہ قادر ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا ہے۔ امریکہ کو چاہئے کہ وہ اسامہ بن لادن سے جنگ کے بجائے امن کی بات چیت کرے۔ جس طرح وہ اسرائیل سے عرفات کی بات چیت امن شروع کروانا چاہتا ہے۔ اسی طرح وہ اسامہ بن لادن سے امن کی بات چیت کرے تاکہ خود اس کے مفادات اور شہری امن کی زندگی گزار سکیں۔ کیونکہ جب 8 سال سے سارا امریکی نظام ایک شخص کو نہیں پکڑ سکا تو ایسے نظام کو دوبارہ کیوں آزمایا جائے۔

16th March, 2001

ہم خیال یا بے خیال

اس وقت مسلم لیگ زبردست انتشار میں مبتلا ہے۔ سابق وزیر اعظم نواز شریف کا جلاوطن ہونا اور نئے قائم مقام صدر جاوید ہاشمی کی نامزدگی اس کی سب سے بڑی وجہ سمجھی جا رہی ہے اگر نواز شریف اپنی بیگم کو نامزد کرنے کے بجائے مشاورت کر کے اپنی معزولی کے دور میں کسی کو قائم مقام صدر بنا لیتے۔ اس سوا سال کے عرصہ میں مسلم لیگی مطمئن ہو جاتے۔ مگر جب جاتے جاتے انہوں نے ایک غیر مقبول مسلم لیگی کو قائم مقام صدر نامزد کیا تو پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔ اول تو ان کی وزیر اعظم کے دوسرے دور میں ہی میاں اظہر نے کھلم کھلا ان کی مخالفت شروع کر دی تھی اور چوہدری برادران در پردہ اس میں شریک تھے۔ پھر بھی نواز شریف صاحب نے اس کا حل تلاش کرنے یا مسلم لیگی عہدیداران کو مطمئن کرنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کی۔ عوام نے دراصل ان کی ضروت سے زیادہ خیال کر کے بھاری مینڈیٹ لا دیا تو وہ سب کو بھلا بیٹھے اور آمرانہ فیصلے کرنے لگے۔

سب سے پہلے انہوں نے چوہدری برادران سے وزیر اعلیٰ پنجاب کے مقابلے میں بے معاملگی کی۔ الیکشن سے پہلے انہوں نے چوہدری برادران کو یقین دہانی کروائی تھی کہ وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری برادران سے ہی ہوگا۔ مگر جب مسلم لیگ نے پنجاب میں پی پی پی کو ہر جگہ سے ہرا دیا تو غالباً انہیں میاں منظور وٹو کا کردار یاد آیا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے دوبارہ رسک نہیں لیا اور سب سے بڑے صوبے میں اپنے بھائی کو بغیر مشاورت کے پنجاب کا وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا۔ جس کا چوہدری برادران نے برا مانا تھا۔ مگر ان پر بھاری مینڈیٹ کا اثر تھا۔ چوہدری برادران خاموش ہو گئے تھے۔ مگر جب مسلم لیگ پر برا وقت آیا تو وزیر اعظم کے حامی اس برے وقت میں نواز شریف کا خیال کرتے ہوئے چپ چاپ تماشا دیکھنے لگے۔ کچھ حکومت نے حوصلہ دیا اور کچھ نواز شریف کی آمرانہ پالیسیوں سے بیزار مسلم لیگیوں نے ہم خیال گروپوں کے نام پر اپنی کاروائیاں شروع

کر دیں۔ گویا نواز شریف ان کا نامزد قائم مقام صدر جاوید ہاشمی حالات کی مجبوری سمجھ کر مسلم لیگ کو اصلی حالت میں زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جاوید ہاشمی نے اپنی مرضی کے بندے سندھ اور پنجاب میں نامزد کرنے شروع کر دیئے۔ جس کا نتیجہ زیادہ تعداد میں مسلم لیگی نواز شریف کی مخالفت میں ہم خیال گروپ میں شامل ہو رہے ہیں اور چاروں صوبوں میں مسلم لیگ کے ہم خیال گروپوں نے مسلم لیگی دفتروں پر قبضہ بھی کر لیا ہے اور اب وہ کھل کر میدان میں اتر آئے ہیں۔ صوبائی عہدیداران تو نامزد ہو چکے ہیں اور صدر کا عہدہ خالی ہے۔ اس خیالی اور ہم خیالی گروپ سے صرف بے خیالی میں اعجاز الحق ابھی تک کسی گروپ میں شامل نہیں ہیں۔ غالباً وہ خود صدارتی امیدوار ہیں۔ چوہدری شجاعت گروپ نے میاں اظہر کو نامزد کر دیا ہے جس کی وجہ سے اعجاز الحق ناراض ہو گئے ہیں۔ ان کو منانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مسلم لیگ کا اجلاس 25 مارچ کو اسلام آباد میں طلب کر لیا گیا ہے اگرچہ اس میں تینوں گروپ مل کر صدر منتخب کریں گے۔ یعنی نواز گروپ سے جاوید ہاشمی۔ ہم خیال گروپ سے میاں اظہر اور تن تنہا گروپ سے اعجاز الحق امیدوار ہیں۔ انکا خیال ہے کہ مسلم لیگ تو ختم ہو چکی تھی انکے والد نے مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کیا اور مثالی بنایا لہٰذا مسلم لیگ کی صدرات پر صرف انہیں کا حق بنتا ہے۔

دوسری طرف انہوں نے فوج سے مفاہمت کے بجائے ان پر کھلم کھلا حملے کئے اس میں ان کی بیگم ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔ ایک طرف وہ فوج سے دو دو ہاتھ کر رہی تھیں۔ دوسری طرف ناراض گروپ پر غصہ کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ عوام میں جانے کی انہوں نے کوشش ہی نہیں کی۔ اور نہ ناراض گروپ کو منانے کی کوشش کی۔ پھر مقدمات کے تمام فیصلے ان کے خلاف گئے۔ عوام نے ان کے حق میں کوئی جلسہ یا جلوس نہیں نکالا۔ وہ اور ان کے وزراء پر کرپشن کے مقدمات عدالتوں میں چل رہے ہیں پھر اچانک ایک صبح وہ اور ان کا تمام خاندان سعودی حکومت کی درخواست پر جلاوطن کر دیا گیا گویا انہوں نے حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے سیاسی موت کے پروانہ پر خود دستخط کر دیئے اور جلاوطنی کی اذیت ناک زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ ویسے تو کیا حالات ہوں گے۔ بظاہر یہ فیصلہ بھی غیر سیاسی نظر آتا ہے اگر وہ پاکستان میں رہ کر سیاسی جدوجہد کرتے تو کم از کم عوام میں تو رہ سکتے تھے۔ اب تو وہ میڈیا سے بھی غائب ہو چکے ہیں۔ سیاسی بیانات اور کہیں آنے جانے پر بھی ان پر پابندی ہے۔ ادھر مسلم لیگ ان کو زندہ رکھنے کے بجائے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں مسلم

لیگ کا سیاسی مستقبل بھی مایوسی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ میدان میں پی پی پی ہی اکیلی جماعت رہ گئی ہے جو چاروں صوبوں کی نمائندگی کرتی ہے مگر سیاسی میدان میں وہ بھی خاموش ہے عوام مایوس ہیں۔ مہنگائی اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے فوج کے پاس بھی اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ جنرل مشرف ٹیم صرف عوام کے حوصلے بڑھانے میں مصروف ہے۔ ابھی تک ان کا کردار اور عزائم صاف ہیں۔ مگر جب تین سال مکمل ہو جائیں گے تو کون ان کی جگہ آئے گا یہ ابھی مبہم ہے۔ سیاسی جوڑ توڑ جاری ہے دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

01st April, 2001

چوکھٹ بدل لیجئے

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف صاحب سابقہ حکمرانوں کی طرح نہ جھوٹ بولتے ہیں اور نہ سچ کو چھپاتے ہیں بلکہ وہ کھلم کھلا اور برملا تلخ حقیقتوں کا اعتراف بھی کر لیتے ہیں۔ مگر کیا اس طرح پاکستانی عوام کے مسائل حل ہو سکتے ہیں کیونکہ مایوسیاں بڑھ رہی ہیں جو توقعات فوجی حکمرانوں سے عوام نے وابستہ کر لی تھیں ایک ایک کر کے دم توڑتی جا رہی ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ جنرل صاحب خود تو ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے مخلص ہیں مگر ان کے اردگرد وزراء، بیوروکریٹ اور مشیر صاحبان ان کو غلط مشوروں سے حالات سدھارنے کے بجائے اور گمبھیر بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور آئے دن ان سے غلط فیصلے کروا کر ان کی مقبولیت کو دن بدن کم کرتے جا رہے ہیں۔

پچھلے دور کے ایک بزرگ جن کا صرف ایک نوجوان بیٹا زندہ رہ گیا تھا، دنیا کی سیاحت کے لئے نکلے انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے سال بعد واپس آسکیں گے تو انہوں نے اپنے نوجوان بیٹے کو کہا کہ جب کوئی اچھی خاتون ملے اس سے شادی کر کے زندگی بسر کر لے کیونکہ وہ دنیا کو نزدیک سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے انکی منزل کتنی دور ہے اور کب تک وہ حالت سفر میں رہیں گے لہٰذا وہ اپنی مرضی سے شادی کر لے یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گئے۔ کئی سال بعد جب وہ واپس لوٹے تو اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے خاتون خانہ نے دروازے کی آڑ میں پوچھا کہ کون ہے؟ بزرگ نے پوچھا کہ گھر میں کوئی مرد ہے تو خاتون نے کہا کہ اس کا شوہر برابر کے گاؤں گیا ہوا ہے۔ ایک آدھ دن میں لوٹے گا۔

بزرگ نے اکیلی خاتون جو ظاہر ہے اس کی بہو تھی اس کے بیٹے کی غیر موجودگی میں گھر میں آنے کے بجائے نزدیک سرائے میں چند دن گزارنے کو ترجیح دی مگر خاتون نے دیکھا کہ بزرگ ہیں تو اس نے پوچھا کہ

آپ کون ہیں؟

(کیونکہ شادی ان کی غیر موجودگی میں ہوئی تھی لہٰذا وہ اپنے سسر کو نہیں جانتی تھی) بزرگ نے فرمایا میں تمہارے شوہر کا خیر خواہ اور نزدیکی رشتہ دار ہوں پھر آجاؤں گا جب تک تمہارا شوہر بھی آجائے گا۔ خاتون نے جب یہ سنا کہ نزدیکی رشتہ دار اور خیر خواہ ہیں تو وہ اپنے شوہر سے بہت نالاں تھی، ان اجنبی بزرگ سے اپنے شوہر کی برائیاں کرتی رہی اور کہا کہ جب سے شادی ہوئی ہے اس کے شوہر سے اس کو کوئی خوشی نہیں ملی۔ یہ کرتا ہے وہ کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بزرگ کو بڑی حیرانی ہوئی، بہرحال جاتے جاتے انہوں نے کہا کہ جب تمہارا شوہر آئے تو کہنا کہ وہ اپنی چوکھٹ بدل لے۔ یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گئے اور نزدیکی سرائے میں جا کر ٹھہر گئے۔ چند روز بعد جب اس کا شوہر لوٹا تو خاتون نے ان بزرگ کا ذکر کیا کہ وہ آئے تھے مگر جاتے جاتے یہ جملہ کہہ گئے تو شوہر سے کہنا کہ وہ اپنی چوکھٹ بدل لے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شوہر سمجھ گیا کہ وہ بزرگ یقیناً اس کے والد ہی ہوں گے۔ اس نے بیوی سے حلیہ پوچھا تو اس کے والد ہی کا حلیہ تھا۔ اس نے بیوی سے پوچھا کہ ان بزرگ سے تم نے کیا کیا باتیں کی تھیں، پہلے تو خاتون نے چھپایا کہ میں نے کوئی بات نہیں کی تھی مگر شوہر کو بہت زیادہ پریشان دیکھ کر کہنے لگی میں نے بس آپ کی معمولی شکایت کی تھی۔ شوہر نے پوچھا کہ وہ کب تک آنے کا کہہ گئے ہیں اس نے کہا کہ واپسی کا دن نہیں بتایا۔ شوہر اور پریشان ہو گیا۔ خاتون نے پوچھا اس میں پریشانی کی کونسی بات ہے، وہ آجائیں گے۔ اور چوکھٹ بدلنے کا مقصد کیا تھا۔ شوہر خاموشی سے گھر سے باہر روانہ ہو گیا اور نزدیکی سرائے میں ڈھونڈنے گیا کہ شاید اس کی غیر موجودگی میں اس کے باپ نے گھر میں آنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ سرائے کے مالک سے حلیہ پوچھا کہ کوئی بزرگ یہاں ٹھہرا ہوا ہے تو اس نے کہا ہاں وہ بزرگ فلانے کمرہ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ فوراً کمرہ میں گیا تو اس کے والد آرام کر رہے تھے۔ آہٹ پا کر انہوں نے آنکھیں کھولیں دیکھا تو ان کا بیٹا دروازے پر کھڑا تھا۔ انہوں نے اندر آنے کے لئے کہا بیٹے نے ادب سے سلام کیا اور پوچھا ابا میں چوکھٹ تو بدل لوں گا مگر اس کا قصور کیا تھا۔ باپ نے کہا عورت گھر چلاتی ہے کوئی بھی اچھی بیوی اپنے شوہر کی برائی ایک اجنبی سے نہیں کر سکتی البتہ اگر شوہر میں خرابیاں ہیں یا تو اس کو مشورہ دے کر اچھائی میں بدل دیتی ہے یا پھر کم از کم اس کی برائی نہیں کرتی ایسی عورت جو شوہر کی پردہ داری نہ کرے وہ گھر گھر نہیں رہتا اس لئے ایسی کمزور چوکھٹ سے لگے رہنا۔ قبل اس کے کہ کوئی بڑا جھگڑا ہو خاموشی سے

چوکھٹ بدل لینی ہی بہتر ہے۔ بیٹا سمجھدار تھا گھر آیا عورت کو طلاق دی اور باپ کو اپنے گھر لے آیا۔

قصہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جب پورا معاشرہ کرپٹ ہو اور کوئی اس کو سدھارنے کی کوشش کرنا چاہے تو کم از کم اس کے مشیر اس کو صحیح سمت بتائیں صحیح مشورے دیں تاکہ وہ برائی کو ختم کرے نہ کہ ایسے اوٹ پٹانگ مشورے دیں کہ ملک صحیح سمت جانے کے بجائے اور غلط راہ پر چل نکلے۔ کم از کم ڈیڑھ سال گزرنے کے باوجود جنرل صاحب آپ کے مشیروں نے آپ کو ایک بھی اچھا مشورہ نہیں دیا۔ بھلا جو مشیر آپ کو غیر ملکی پاکستانیوں سے دو لاکھ ڈالر فی کس منگوا کر ملک کے قرضے اتارنے کی بات کرتا ہے، بھلا اس طرح قرضے اترتے ہیں قرضے صرف اپنے غیر ضروری اور شاہانہ اخراجات کم کرنے سے ہی اتر سکتے ہیں۔ اور آئندہ قرضے نہ لینے سے ہی نجات مل سکتی ہے۔

میں نے آج سے ایک سال پہلے تحریر کیا تھا ''میں نے ہر دیار غیر میں رہنے والے پاکستانیوں سے صرف 500 ڈالر بھجوانے کا مشورہ دیا تھا اگر اس کی تشہیر کی جاتی تو یقیناً اس پر مثبت نتائج نکل سکتے تھے۔''

بھلا جو مشیر ٹیکس پر ٹیکس لگانے کا مشورہ دے، تاجروں کو دھمکیاں ملیں، وہاں کہیں صنعت کار اور تاجر ٹھہریں گے۔ صبح شام جنہیں بل پر بل بھگتنانے اور جرمانے کی صدائیں سنائی دیں اور جہاں ان کی جان و مال کی بھی حفاظت نہ ہو، جہاں خود پولیس ملوث ہو اور پھر پوچھا جائے کہ ہمارے تاجر اور صنعت کار کیوں ہجرت کر رہے ہیں۔

دبئی کی مثال ہمارے سامنے ہے، 1970ء تک وہاں گرمی اور دھول تھی۔ معمولی سا ایئرپورٹ تھا، انہوں نے صرف صنعت سازی کی طرف توجہ دی کوئی ٹیکس نہیں ہے صرف سروس چارجز ہیں، لائسنس فیس ہیں آج صنعتی میدان میں ہم سے بہت آگے ہے، ہمارے پورے ملک میں جتنے بھی صنعتی یونٹ ہیں ان سے کئی گناہ زیادہ اور بڑے بڑے صنعتی یونٹ ہندوستانی اور پاکستانی باشندوں کے لگے ہوئے ہیں۔ ہزاروں ہوٹلز اور ریسٹوران ہیں، کون سے ملک کا سیاح ہے جو صرف بیس لاکھ افراد کے شہر میں نہیں آتا۔ یوروپین ایئرپورٹس سے کہیں بڑا صرف دبئی کا ایئرپورٹ ہے ان کے مشیر اچھے ہیں وہ صحیح مشورے دیتے ہیں اس لئے ترقی کر رہے ہیں۔ جن مشیروں، بیوروکریٹوں اور وزیروں کے گھر میں لاکھوں گاڑیاں ہوں اور وہ ایک روپیہ پیٹرول کے لئے نہ دیں۔ اور عوام کے لئے اس کے نرخ بڑھا کر وصول کرنے کا مشورہ دیں خود سرکاری رہائش گاہ میں

رہیں، دن رات بجلی استعمال کریں ایک روپیہ کا بل نہ بھریں اور عوام کو بجلی کے نرخ اور اس پر سرچارج فیول ایڈجسٹمنٹ اور اس پر بھی اضافی سرچارج لگانے کا مشورہ دیں اور دن دن بھر بجلی بھی غائب رہے، لوڈشیڈنگ ہو اور عوام کو احتجاج بھی کرے کا حق نہ ہو بھلا صنعت کاری کے لئے کئی کئی گنا بجلی کے دام وصول کئے جائیں پوری دنیا میں صنعت کاری کے لئے سب سے کم نرخ پر بجلی اور گیس فراہم کی جاتی ہے تب جا کر اس ملک میں صنعت کاری پروان چڑھتی ہے۔ بھلا چھاپوں اور پکڑ دھکڑ سے اور تاجروں کو ہراساں کرنے سے ملک کی معیشت سدھر سکتی ہے۔ جو مشیر عبدالقدیر خان جیسے نایاب لوگوں کو سبکدوش کرنے کا مشورہ دیں، جو مشیر سیاست کے ایک دھڑے کو کندھوں پر بٹھائیں اور دوسرے دھڑے کو یوم آزادی کے موقع پر جلسہ تک نہ کرنے دیں، جو مشیر ایک سیاستدان کو جیل میں ڈالیں اور دوسرے کو جلاوطن کرنے کا مشورہ دیں خدارا پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے آپ چوکھٹ بدل لیں۔ تجربات کے لئے ڈیڑھ سال بہت بڑا عرصہ ہوتا ہے اب بقایا ڈیڑھ سال کے لئے اچھے اور قابل مشیر لائیں، جو ملا عمر کی طرح افغانستان کو سادگی اور پروقار زندگی گزارنے کی کوشش کروانے کا مشورہ دے۔ ایسے مشیر نہ لائیں جب وہ خود سیاست میں تھے تو جمہوریت کا نعرہ لگاتے تھے اور آج وزارت ملی تو خود تو جلسہ کر رہے ہیں اور دوسروں کو جلسہ گاہ تک بھی نہیں پہنچنے دیتے بلکہ مضحکہ خیز بیان دے کر اگرائے۔ آر۔ ڈی کا جلسہ نہ روکا جاتا تو ملک ٹوٹ جاتا۔ **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** ایسے مشیر لائیے جو پاکستان کے عوام کی بھلائی کا مشورہ دیں اور ٹھوس اقدامات کریں نہ کہ جنرل صاحب اور جو دردمند دل رکھتے ہیں، خوشامدیوں سے دور رہیں بے شک زندگی بھر آپ نے سیاست نہیں کی اس کا آپ کو نیا تجربہ ہے تمام سیاستدان تو چور نہیں ہیں، سیاسی عمل کو ختم نہیں کریں۔ اگر فوج بھی ناکام ہوگئی تو ملک کا انجام کیا ہوگا وقت کم ہے عوام کو مایوسیوں سے نجات دلوائیں۔

06th April, 2001

جب ہم مقروض نہیں تھے

اللہ اللہ کیا زمانہ تھا۔ پاکستان کو بنے دس سال ہو چکے تھے۔ ہماری کرنسی بڑی مضبوط تھی ڈالر صرف پانچ روپے اور پونڈ دس روپے کے اندر ہوتا تھا۔ مغربی ممالک میں روپیہ اور جرمن مارک، سوئس فرینک برابر تھے۔ فرانس کا سکہ اور ہانگ کانگ کا سکہ دس دس آنے کا تھا۔ بہت سے ممالک سے ہمارا روپیہ بڑا تھا۔ بے شک حکومت آئے دن آتی جاتی رہتی تھی مگر ہمارا سکہ مضبوط تھا کیونکہ ہم مقروض نہیں تھے۔ ہمارے ٹھاٹ باٹ شاہانہ نہیں تھے۔ چار روپے میں سیمنٹ کی بوری مل جاتی تھی۔ امیر اور غریب کی پہچان بکرے اور گائے کے گوشت سے سمجھی جاتی تھی۔ وہ بھی ڈیڑھ روپے کلو بکرے کا گوشت تھا تو بارہ آنے، گائے کا گوشت ہوتا تھا۔ ہماری اپنی امپورٹ پالیسی تھی۔ درآمدات اور برآمدات میں توازن تھا۔ دولت کی کوئی ریل پیل نہیں تھی۔ مگر دولت سے زیادہ شرافت کی پہچان تھی۔ بزرگوں کا ادب کیا جاتا تھا۔ محلّہ میں شخصیت کے حوالے سے لوگ پہچانے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ اگرچہ صنعتیں برائے نام تھیں مگر زندگی سادگی سے گزر رہی تھی۔ برائے نام لوگ باہر جا کر آباد ہوتے تھے مغربی پاکستان سے آزاد کشمیر اور پنڈی سے لوگ سمندر پار نوکری کی تلاش میں بے شک جاتے تھے تو مشرقی پاکستان سے عموماً سلہٹ اور چاٹگام سے بنگالی لندن اور مانچسٹر میں ہوٹل کھولتے تھے۔ اور وہاں سے کما کر پاکستان زرمبادلہ بھیجتے تھے۔ پوری کراچی میں چند سو کاریں تھیں زیادہ تر لوگ بسوں اور ہاتھ والے رکشوں پر سفر کرتے تھے۔

پھر ایک دن 1958ء میں یہی اکتوبر کا مہینہ تھا کہ جنرل ایوب خان نے مارشل لاء لگا دیا۔ عوام نے گرم جوشی سے اس کا استقبال بھی کیا۔ عوام آئے دن سیاست دانوں کی جوڑ توڑ سے بیزار تھے۔ فوج سے اچھی

توقعات وابستہ کرلیں شروع شروع حکومت نے انقلابی اقدامات کئے اور زرعی اصلاحات کی نئی نئی صنعتوں کے لئے لائسنس اور قرضے دینے شروع کئے۔ صنعتی زمینیں صرف چار روپے گز اور رہائشی زمین 15 سے 25 روپے گز الاٹ کرنی شروع کر دیں۔ نئے نئے کارخانے لگتے گئے اور ہم نے صنعتی پیداوار بڑھانی شروع کی۔ کراچی پاکستان کا دل اور صدر مقام (Capital) تھا۔ یکا یک راتوں رات کیپیٹل (Capital) کو کراچی سے اسلام آباد منتقل کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ جبکہ اسلام آباد ابھی بنا بھی نہیں تھا۔ وہیں سے ہم نے شاہانہ اخراجات کرنے کی پہلی اینٹ رکھ دی دن رات اسلام آباد بنانے میں لگ گئے۔ روپیہ سکڑنا شروع ہو گیا۔ اپنی چادر سے ہم نے پاؤں نکالنے شروع کر دیئے۔ اس کے لئے ہم کو سرمایہ درکار تھا۔ پہلے نوٹ چھاپے پھر اس نوزائیدہ دارالخلافہ کے لئے ہم نے پہلے عوام سے قرضے لئے پھر دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلانے شروع کر دیئے۔ امریکہ سے امداد لی اور پھر یورپی ممالک بھی امداد دینے لگے۔ کچھ ممالک سے ہم نے مال کے بدلے مال کا سودا کیا۔ 1965ء کی جنگ لڑی اور ہندوستان کو بتا دیا کہ ہم اپنی آزادی اور خودداری کے معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ میدان میں جنگ جیت کر ہم تاشقند کی ٹیبل سے ہار کر سمجھوتہ کر آئے۔ وقت تیز رفتاری سے آگے بڑھتا گیا۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں صرف امریکہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ ممالک میں جانے کے لئے ویزہ درکار ہوتا تھا باقی تمام دنیا میں جانے کے لئے صرف پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی تھی۔ پھر مارشل لاء کا دور ختم ہوا۔ ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ ہم نے مشرقی پاکستان اپنی کوتاہیوں سے گنوا دیا۔ لوگوں نے کہا۔ چھڈو یار بڑے بھائی سے جان چھوٹ گئی۔ نئی حکومت نے راتوں رات انقلابی اقدامات شروع کئے۔ بڑے بڑے تمام صنعتی ادارے قومیائے گئے۔ بینک اور انشورنس اس میں سرفہرست تھے۔ یہاں سے صنعتی انقلاب جو 1958ء کے مارشل لاء سے آیا تھا 1972ء میں دم توڑنے لگا۔ تعلیمی ادارے اپنا کر ہم نے تعلیم کے میدان میں شب و خون مارا۔ حتیٰ کہ اپنے مطلب کے لئے مسجدیں اور مدارس بھی نہیں چھوڑے۔ مزدور کو صنعت کاروں سے لڑوایا۔ پہلی مرتبہ ہمارے صنعت کار دل برداشتہ ہو کر بیرون ملک جا کر نئے سرے سے صنعت کاری کرنے لگے۔ ہمارے مزدور بھی اب باہر روزگار کی تلاش میں نکل گئے۔ صنعت کاری کو زبردست دھچکہ لگا۔ بھلا حکومت بھی صنعت کاری کر سکتی ہے یہ ہم نے نہیں سوچا۔ نتیجہ ہم نے قرضے لینے شروع کر دیئے اور بھرپور قرضے لئے۔ لمبے لمبے عرصے کے لئے قرضے لئے۔ ڈالر ایک دم دوگنا ہو گیا۔ ہماری کرنسی

کی ساکھ گرنا شروع ہوگئی۔ ہم کل کمانے کی امید میں قرضے بڑھاتے گئے۔ اور ساتھ ساتھ شاہانہ زندگی گزارنے لگے۔ قصر صدر، قصر وزیراعظم بڑے بڑے سیکریٹریٹ انہی قرضوں سے ہم نے تعمیر کئے۔ اتنا بڑا صدارتی محل بنانا شروع کیا کہ اس کا پتھر ایوب خان نے رکھا۔ یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو کے دور بھی مکمل نہیں ہوسکا۔ ضیاء الحق بھی اپنے دور کے آخری دنوں میں صدارتی محل میں گئے تھے۔ البتہ غلام اسحاق خان پہلے ہی دن سے قصر صدارت میں شفٹ ہوگئے تھے۔ پہلے وزیراعظم یا صدر کے ساتھ چند وزراء اور سینئر بیوروکریٹ غیر ملکی دوروں پر جاتے تھے اور وہ بھی سال میں دو تین دورے ہوتے تھے۔ مگر جب قرضوں کی برکت سے ہر ماہ دورے ہونے لگے وزراء کے ساتھ اب یار دوست قومی وصوبائی اور سینٹ کے اراکین سے بھر کر جہاز دوروں پر جانے لگا۔ پہلے عام جہازوں سے جاتے تھے اب ذاتی جہاز خرید لئے گئے۔ ہر وزیراعلیٰ کا الگ جہاز، گورنروں کا الگ اور سب سے بڑا جہاز صدر اور وزیراعظم کے لئے وقف کردیا گیا۔

ضیاء الحق کے دور میں سادگی تھی۔ مگر افغانستان کی جنگ میں ہم نے خوب اسلحہ خریدا۔ کچھ قرض بھی معاف کروائے۔ مگر پھر عوامی دور شروع ہوا۔ تو ہم نے سادگی کو لپیٹ کر صدارتی محل کے تہہ خانے میں بند کر کے رکھ دیا اور امارت کی چادر تان لی۔ خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ ہر چیز کی درآمد شروع کردی گاڑیوں کی یلغار سامان تعیش، کھانے پینے کی اشیاء کے ڈھیر لگادئے۔ پاکستان کو غیر ملکی سامان سے بھر دیا۔ اب برآمدات کم اور درآمدات بڑھتی گئیں۔ پھر انہی صنعتوں کو جن کو ہم نے قومیایا تھا اونے پونے داموں بیچنا شروع کردیا۔ اسی طرح قرضوں کو اب لوٹانا تھا۔ سود کی رقمیں ادا کرنی تھیں۔ کہاں تک نوٹ چھاپتے لہٰذا قرضوں کی ادائیگی کے لئے نئے قرضے لینے لگے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے اپنی من مانی شرطیں عائد کرنا شروع کردیں ہم پھر بھی باز نہیں آئے۔ اپنے اخراجات کم کرنے کے بجائے اور بڑھادیئے۔ دوستوں کو نوازنا، اسمبلی کے اراکین کی خرید وفروخت شروع ہوگئی۔ حکومتیں ٹوٹتی گئیں۔ پھر بنتی گئیں۔ رشوت کا بازار خود حکومت نے کھول لیا۔ عوام کی کسی کو فکر نہیں تھی۔ الیکشن کروانا فیشن بن گیا۔ اور آخری الیکشن میں صرف 26 فیصد ووٹ پڑے۔ اور ایک پارٹی تنہا 14 فیصد ووٹ لے کر بھاری مینڈیٹ کا نعرہ لگا کر اپنے آپ کو بھلا بیٹھی اور عوام نے دیکھا اس پارٹی کے سربراہ نے تمام اخلاقی آداب جہاں سادگی بند تھی اسی تہ خانے میں دفنادیئے۔ عدلیہ سے دو دو ہاتھ کئے۔

صدر کا تیا پانچہ کیا۔ فوجی جرنیل کو فارغ کیا۔ معیشت کا بھٹہ بیٹھ چکا تھا۔ آخری وار خالی گیا اور ملک میں دوبارہ فوج کو مداخلت کرنا پڑی۔ کل کا مطلق العنان پاکستان کا حکمران آج حسرت سے پاکستان آنے کو ترس رہا ہے ڈیڑھ سال اس حکومت کو بھی ہوچلا ہے۔ جنرل پرویز معیشت کو سدھارنے کے لئے دن رات لگے ہوئے ہیں۔ مگر معیشت کی حالت اتنی پتلی ہوچکی تھی کہ سنبھل کر نہیں دے رہی ہے۔ اگرچہ ان کی نیت ٹھیک ہے مگر ان سے غلط سلط فیصلے کروا کر بدنام کرنے کی مہم جاری ہے۔ ایک سال میں بے شک معیشت 50 فیصد بگڑی ہوئی عادات کے سبب نہیں سدھر سکتی۔ مگر خدارا عوام کے سروں پر مہنگائی کا بوجھ نہ بڑھاؤ۔ ڈالر روز گردشوں میں آرہا ہے سندھ بارشوں کے نہ ہونے سے قحط کی طرف بڑھ رہا ہے پانی کے جھگڑوں میں الجھ کر عوام کو مزید پریشانی لاحق ہوچکی ہے سندھ کی زمینیں بنجر ہورہی ہیں۔ ایک طرف دریا خشک ہورہے ہیں۔ پیداوار کم ہورہی تھی تو دوسری طرف زرعی ادویات پر سیلز ٹیکس مذاق نہیں تو اور کیا ہے بجائے زمینداروں کے آنسو پونچھنے کے ان پر 15 فیصد سیلز ٹیکس لگانا کہاں کی عقلمندی ہے کس نے ایسا واہیات مشورہ دیا ہے۔ پہلے مہنگائی کم تھی جو سیلز ٹیکس لگانے کی سوجھی۔ عوام کی تکالیف کے کالم بھرے پڑے ہیں مگر کوئی بھی مداوا کرنے کے لئے آگے نہیں آرہا۔ قرضوں کے ملنے پر خوشی کے لڈو بانٹے جاتے ہیں۔ پھر تین مہینے کے بعد نئے قرضوں کو فخر سے وصول کیا جاتا ہے۔ اس کے ملنے کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اپنی غیرت کو گروی رکھ کر تمام شرائط پوری کرنے کی یقین دہانی کروائی جاتی ہے۔ آخر کب تک گلشن کا کاروبار اس طرح چلے گا۔ کب تک ناامیدی کا سورج غروب ہوگا۔ قرضوں سے نجات کا کوئی راستہ اپنانا ہوگا۔ ورنہ ہمارا حشر بھی اب زیادہ دوری پر نہیں ہے دشمن ہماری گھات لگائے بیٹھا ہے۔ ہم کو کب ہوش آئے گا۔ ہر دوسرا شخص اس سرزمین سے باہر جانے کی بات کررہا ہے عوام کو اعتماد میں لیجئے اور معیشت سدھارنے کے اقدامات کیجئے اور پہلے قرضوں کو لینا بند کیجئے ورنہ معیشت کبھی نہیں سدھر سکے گی۔ خاص طور پر 2005ء تک جب W.T.O یعنی ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کا انعقاد ہوگا جس کے تحت ہر ملک اپنی برآمدات دوسرے ملک میں ایکسپورٹ کرسکے گا۔ کیا پاکستان ہندوستان کی صنعت کا مقابلہ کرسکے گا۔ اس کی تیاری ہم نے کرلی ہے؟

19th April, 2001

خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

1995ء میں پی پی پی کے دوسرے دور میں محترمہ بے نظیر صاحبہ نے ''کراچی پیکیج'' کے نام کا منصوبہ پیش کیا جس میں 21 ارب روپے کراچی کی تعمیر و ترقی کے لئے مختص کئے تھے جس میں صنعت کاری، سمندر میں میٹھا پانی بنانے کے لئے ڈی سلائین واٹر پلانٹ، ٹرانسپورٹ، سڑکیں، کراچی اوور ہیڈ سپروے، بائی پاس وغیرہ وغیرہ شامل تھے اس کا زبردست پروپیگنڈہ بھی کیا گیا کہ ہم کراچی کے لئے اتنا بڑا پروجیکٹ دے رہے ہیں۔ اس موقع پر میں نے بے نظیر بھٹو صاحبہ کو مشورہ دیا تھا کہ ان 21 ارب روپے میں سے صرف 3 ارب روپے کراچی کے 61185 خاندانوں میں تقسیم کر دیں جنہوں نے جعلی فنانس کمپنیوں میں لگائے تھے اور عرصہ دراز سے یہ رقم ڈوب چکی ہے کیونکہ یہ انویسٹمنٹ کمپنیاں کھلم کھلا عوام کو دھوکہ دے کر ملک سے فرار ہو چکی ہیں۔ یا پھر روپوش ہیں اور سرکاری ادارے رشوت لے کر ان کو چھوڑ چکے ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ انہی کی حکومت اسی قسم کا واقعہ پنجاب میں جعلی کوآپریٹو سوسائٹی اور کوآپریٹو بینک کے دھوکہ کھانے والے افراد کی پچاس پچاس ہزار روپے کی دو اقساط مرکز کے تعاون سے ادا کر چکی ہے تو سندھ کے معاملے میں یہ زیادتی کیوں ہے ایک صوبہ کے لئے کچھ مراعات ہیں اور دوسرے صوبے کے لئے وہ مراعات کیوں نہیں۔ مگر انہوں نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا اور کراچی والوں کی رقم آج تک ڈوبی ہوئی ہے۔

آج نیب (NAB) کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ نیب نے 7 ارب روپے پنجاب کے جعلی دھوکہ باز کوآپریٹو سوسائٹی اور کوآپریٹو بینک کے مالکان سے وصول کر کے ان کے کھاتے داروں میں تقسیم کرنے کا معاملہ طے پا گیا ہے اور تقریباً 81129 افراد کو 7 ارب روپے ان بینک اور کارپوریشن کے مالکان سے وصول کر کے جلد ہی تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ گویا اس حکومت نے بھی پنجاب کے کھاتے داروں کو تو اولیت

دی مگر سندھ میں نیب نے ان جعلی انویسٹمنٹ کمپنیوں کے مالکان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ یہ سراسر ناانصافی ہے ان جعلی کمپنیوں میں انویسٹمنٹ کرنے والوں میں اکثریت بوڑھے، پنشن یافتہ اور بیوگان کی سب سے زیادہ ہے جنہوں نے اپنی عمر بھر کی کمائی ان دھوکے باز جعلی کمپنیوں کے مالکان کے بڑے بڑے دعویداروں کے پروجیکٹ میں لگا دی۔ کسی نے بھی کوئی پروجیکٹ شروع نہیں کیا۔ جن میں صمد دادا بھائی۔ ٹی جے ابراہیم۔ پائنیر الائنس کارپوریشن۔ الائنس موٹر لمیٹڈ۔ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ بخاری موٹرز لمیٹڈ۔ شاہد اختر اینڈ کمپنی۔ شاہد مختار اینڈ کمپنی۔ ملٹی انڈسٹریل کارپوریشن۔ سجاد اینڈ کمپنی۔ فرخ اینڈ برادرز۔ واحد الماری والا۔ شیخ اینڈ سنز۔ یونائیٹڈ انوسمنٹ کمپنی سرفہرست ہیں۔ ان چودہ کمپنیوں کے بیشتر حصہ دار آج بھی دیگر کاروبار کر رہے ہیں۔ تقریباً ایک ارب روپے کی جائیدادیں آج بھی سیل پڑی ہیں۔ کچھ نے پولیس سے مل کر واگزار کرالی ہیں۔ کچھ عدالت عالیہ کے رجسٹرار کے پاس نجکاری کے یا آکشن کے لئے پڑی ہیں۔ مگر دس سال گذر جانے کے باوجود اس مظلوم کھاتے داروں کو کچھ نہیں مل سکا۔ کچھ تو انتظار نہ کرتے کرتے اس دنیا سے حسرت لئے چلے گئے باقی ناامیدی کے غار میں پڑے آخری دن گن رہے ہیں۔ خدارا انصاف کو الگ الگ صوبے میں تقسیم کر کے لوگوں کو اشتعال نہ دلوائیں۔ اس دوغلے قانون کو اور ہوا نہ دیں۔ اس صوبے میں رہنے والوں کا کیا قصور ہے۔ جب پنجاب کے دھوکے باز مالکان کو نیب گرفتار کر کے ان سے رقم وصول کر سکتی ہے تو سندھ کے ان دھوکے باز انویسٹمنٹ کمپنیوں کے حصہ داروں کو کیوں کھلی لگام دے رکھی ہے ان کے خلاف فوری اور سخت کارروائی کر کے ان حصہ داروں کو گرفتار کر کے ان سے تین ارب با آسانی وصول کئے جا سکتے ہیں۔ ان کی جائیدادیں جو حکومت کی تحویل میں ہیں نیلام کر کے اور بقایا ان کے حصہ داروں سے وصول کر کے ان مظلوم کھاتے داروں میں تقسیم کر کے نیب شاندار کارنامہ انجام دے سکتی ہے ابھی یہ کالم لکھ رہا تھا کہ جنرل پرویز صاحب نے PERK کے نام سے کراچی کو ہانگ کانگ بنانے کے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ تفصیلات پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ حکومت کراچی کو اس کا مقام دوبارہ دلانا چاہتی ہے۔ حکومت نے بھی پہلی والی حکومت کی طرح سمندر سے میٹھے پانی بنانے کا پلانٹ، صنعت سازی کے لئے گھر گھر انڈسٹری لگانے، ایک کروڑ گیلن میٹھے پانی کی فراہمی، شہری حکومت کا قیام، سڑکوں کی مرمت، کے ای ایس سی (KESC) کی نجکاری، دیگر مراعات ترجیحی طور پر وغیرہ وغیرہ..... مگر ساتھ ساتھ یہ بھی عندیہ دیا ہے کہ یہ منصوبہ صاحب ثروت اور مخیّر حضرات کے تعاون سے تکمیل کیا

جائے گا۔ ساتھ ساتھ مرکز بھی اس کار خیر اور مثالی پیکیج میں برابر کا حصہ دار ہوگا۔

اگرچہ منصوبہ بھی پچھلی حکومتوں کی طرح بڑے شاندار طریقہ سے پیش کیا گیا ہے مگر ہمارے عوام اب خوش فہمی کے خول سے باہر آچکے ہیں۔ اگر حکومت بھی اس میں مخلص ہے تو سب سے پہلے خیر سگالی اور اپنے مخلص ہونے کے لئے تین ارب روپے کراچی کے 61185 خاندانوں میں تقسیم کرے۔ میرے پاس اس کا تمام ریکارڈ محفوظ ہے۔ اصلی کاغذات کے عوض یہ رقم ان حصہ داروں یا ان کے لواحقین میں فوری طور پر تقسیم کرے اور ساتھ ساتھ ان کمپنیوں کے مالکان کو گرفتار کر کے ان سے یہ رقم وصول کرے۔ اس سے خود جنرل صاحب اور فوج کا عوام میں بلند وقار ثابت ہوگا اور صاحب ثروت مخیّر افراد بھی آگے آئیں گے اور اس منصوبے کو کامیاب بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ اگر حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو کراچی کے حصہ میں ہمیشہ ناانصافی اور ناامیدی ہی آئی ہے ہر حکومت اس کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کرتی رہی ہے بھلا سب سے زیادہ ٹیکس دے کر عوام کو کیا ملا ہے سب سے پہلے راتوں رات کراچی جیسے آباد علاقے سے دارالخلافہ اٹھا کر جنگل میں اسلام آباد کے نام منتقل کر دیا۔ پاکستان کی خاطر عوام خاموش رہے۔ لگتا یوں تھا کہ سمندر ان سے نہیں اٹھ سکا ورنہ اس کو بھی اٹھا کر اسلام آباد کی پہاڑیوں کے بیچ میں منتقل کر دیتے۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے کہ کاروبار کراچی میں ہو اور ٹیکسوں کا ہیڈ آفس اسلام آباد میں ہو سمندر کراچی میں ہو اور نیوی کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں ہو ٹیکس کراچی والے دیں اور سڑکیں و محلات، باغات، ہائی وے اسلام آباد میں بنیں۔ یہ ناانصافی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے خدا کا شکر ہے کہ جنرل صاحب نے کہا کہ میں کراچی سے ہوں کراچی مجھ سے ہے۔ مگر عملی طور پر دیکھا جائے تو کراچی کے لوگ ٹینکرز سے پانی الگ خریدتے ہیں اور پانی کا ٹیکس الگ ادا کرتے ہیں۔ سارے سال ٹینکر سے پانی خریدنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اپنی حفاظت کے لئے اپنے پیسے سے گارڈ رکھتے ہیں۔ کیونکہ رینجرز اور پولیس کے باوجود ان کی حفاظت کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔ بجلی کے لئے وہ جنریٹر کے غلام ہیں۔ کئی کئی دن بجلی چلی جاتی ہے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے ادھر گرمی شروع، ادھر بجلی غائب ابھی تو بارش نہیں ہوئی پہلے قطرے کے ساتھ ہی بجلی غائب۔ مگر بجلی کے بلوں پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پہلے سے بھی زیادہ بل آرہا ہے کوئی ہے جو ان سے پوچھے۔ کہ کیا کراچی کو ہانگ کانگ بنا دیں گے۔ گھر گھر انڈسٹریاں لگائی جائیں گی۔ ہانگ کانگ میں انڈسٹریوں کے لئے سب سے کم نرخ بجلی کے ہیں جبکہ کراچی میں کمرشل اور انڈسٹریل بجلی کے نرخ گھریلو نرخ سے تین گنا زیادہ ہیں۔

اگر کسی گھر پر آپ نے انڈسٹری قائم کر دی تو سمجھ لیجئے بھڑ کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ ایسے ایسے محکموں کی یلغار ہوگی کہ آپ صبح شام انڈسٹری کیا چلائیں گے۔ محکموں کو بھگتے بھگتے تھک جائیں گے۔ فوری طور پر بجلی والوں کا حملہ ہوگا کہ میٹر تبدیل کریں۔ کمرشل کروائیں۔ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن والے آکر اپنا نیا فارم دے جائیں گے۔ اولڈ ایج والے رجسٹریشن کے لئے آجائیں گے۔ بڑے اخلاص سے انکم ٹیکس والے بھی کہیں گے جناب یہ کٹوتی شروع کر دیں اور ہر روز پانچ فیصد کٹوتی کی رقم انکم ٹیکس کے کھاتے میں جمع کرواتے رہیں۔ ان سے جان چھوٹی تو لیبر انسپکٹر صاحب تشریف لے آئیں گے۔ یہ رجسٹر کیوں نہیں ہے، یہ نقشہ کیوں نہیں لگایا۔ کس کس محکمہ کا ذکر کروں۔ میرا گورنر سندھ اور جنرل صاحب کو مشورہ ہے۔ اگر واقعی آپ کراچی کو ہانگ کانگ بنانا چاہتے ہیں تو تمام محکمے ایک کر کے صرف ایک ٹیکس کا نفاذ کریں اور اس کا عملہ کراچی چیمبر اور متعلقہ ایسوسی ایشن کے نمائندوں کے تعاون سے عوام اور صنعت کاری کے لئے اچھی روایات قائم کریں۔ بجلی، گیس، پانی کی فراہمی کا نیا نظام قائم کریں اور کم سے کم نرخ پر دیگر سہولتوں کے ساتھ ساتھ فوری طور پر کنکشن دیں۔ چھاپے، دھونس، ڈراوے سے اب انڈسٹریاں نہیں چلتیں۔ شکایات کے مراکز قائم کریں۔ اور عوام کو نمائندگی دیں کہ وہ ان کی شکایات کا ازالہ کریں۔ آپ کہہ رہے ہیں ہم کراچی کو خوشحال اور پہلے والا مقام دلانا چاہتے ہیں۔ آپ کے منصوبے پر خود کراچی کی بلدیہ جس نے آج تک سڑکوں کی مرمت نہیں کی۔ جہاں پانی اور کچرہ سالوں سے پڑا ہے۔ مگر کراچی کی تمام سڑکیں بیچ دیں اور ہر اسکوٹر سے پانچ روپے اور ہر گاڑی سے دس روپے فی گھنٹہ پارکنگ چارجز مقرر کر دیں۔ ایک تو خریدار غائب تھا مندی کا رجحان اوپر سے اگر خریدار ایک منٹ کے لئے بھی کہیں رکے دس روپے کار پارکنگ خود دکانداروں اور دفتروں سے ان کے سامنے کھڑی کرنے کے لئے 3600 روپے اسکوٹر کے اور چھ ہزار روپے سالانہ فی گاڑی وصول کئے جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آسکی کہ ہم یورپ اور امریکہ کے ٹیکس کا نظام تو فوری اپنا لیتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ کہ ان ترقی پذیر ملکوں میں عوام کو مراعات انڈسٹریلائزیشن کی طرف راغب کر سکتی ہیں۔ ہانگ کانگ کیا ہے عوام کی معلومات کے لئے ہانگ کانگ صرف دو جزیروں پر مشتمل ایک ملک ہے ہانگ کانگ میں انکم ٹیکس کی شرح صرف 15 فیصد ہے اس کے علاوہ نہ وہاں کوئی جی ایس ٹی ہے اور نہ ہی کوئی اور ٹیکس ہے حکومت کے تمام اخراجات اسی ٹیکس سے چلتے ہیں۔ جمہوریت بھی مثالی ہے عدلیہ اتنی مضبوط ہے کہ دنیا میں اس کی مثال دی جاتی ہے تیس سال پہلے تو پولیس میں

پاکستانی بہت نمایاں تھے صرف ایک جزیرہ نما ملک کی برآمدات پاکستان سے پانچ گنا ہیں خوبصورت بلڈنگیں، رہائش ہی کے لئے نہیں بلکہ صنعت سازی کے لئے بھی انتہائی موزوں بنائی جاتی ہیں۔ ہر منزل پر بھاری مشینری والی صنعتیں قائم ہیں۔ ایک زمانہ تک تو ان کا ایئرپورٹ بھی سمندر کے بیچ میں بنایا گیا تھا کیونکہ زمین ہی نہیں تھی دو جزیروں یعنی ہانگ کانگ اور کولون (Kowloon) کو سمندر کے بیچ راستہ سرنگ بنا کر ملا دیا گیا ہے جو خود ایک عجوبہ ہے کیا ہم ایسی مراعات دے سکتے ہیں کیا ہم ایسی جمہوریت اور عدالتی نظام قائم کر سکتے ہیں۔ اگر ایسا کر سکتے ہیں تو جب ہم ہانگ کانگ کا مقابلہ کرنے چلے ہیں جہاں سو فیصد عوامی شعبہ ہے بینک انشورنس، تعلیم، صحت، صنعت، پر حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے پچھلی حکومت نے پاکستان کو ایشین ٹائیگرز بنانے کا اعلان کیا تھا۔ پاکستان ٹائیگر تو کیا بنا جاتے جاتے اس کو بلی سے بھی چوہا بنا کر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے چوہے دان میں رکھ کر خود آزاد فضاؤں میں اپنے خاندان کے ساتھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ اگر موجودہ حکومت واقعی ہانگ کانگ بنانا چاہتی ہے تو اس کو انقلابی اقدامات کرنے ہوں گے۔ نئی اور پرانی صنعت سازی کے لئے اس کو لاء اینڈ آرڈر کو ترجیحی بنیاد پر درست کرنا ہوگا۔ قانون کی حکمرانی عملاً کرنی ہوگی۔ جمہوریت سب کے لئے عام ہوگی۔ تمام نجکاری کرنی ہوگی۔ صنعت کا کوئی شعبہ حکومت کے پاس نہیں ہوگا۔ آسان اور سہل قوانین بنانے ہوں گے۔ عوام کو بنیادی سہولتیں عام کرنی ہوں گی۔ ہانگ کانگ کی طرح عوام کو تعلیم اور صحت مفت فراہم کرنی ہوں گے۔ یاد رکھیئے جہاں تعلیم ہوگی وہاں ہی ترقی ہوگی۔ ہانگ کانگ میں ایک زمانہ تک سبزی بھی چائنا سے امپورٹ ہوتی تھی۔ کیونکہ انتہائی چھوٹا جزیرہ تھا۔ ہر چیز امپورٹ کرتا تھا۔ مگر آج دنیا کی کوئی چیز سوئی سے لے کر جہاز تک یہ جزیرہ اپنے ملک میں بناتا ہے اور ایکسپورٹ کرتا ہے تمام غیر ملکی اداروں (ملٹی نیشنل) کے ہیڈ آفس برائے ایشیاء ہانگ کانگ میں قائم ہیں اور یہیں سے پوری دنیا کو مال سپلائی کرتے ہیں اور پورا کنٹرول کرتے ہیں۔ اس جزیرہ سے ہی اربوں ڈالر کا امپورٹ اور ایکسپورٹ ہوتا ہے ہمارے ملک میں جتنے ایک اسٹار سے 5 اسٹار تک ہوٹل ہیں اس سے کم از کم پچاس گنا ہوٹل ہیں۔ جو سیاحوں سے ہر وقت بھرے رہتے ہیں۔ اب تو عمارتیں کم از کم 20 منزلہ ہوتی ہیں۔ آج تک بجلی کی آنکھ مچھولی دیکھنے میں نہیں آتی۔ لوگ رات گئے تک جاگتے ہیں۔ سیاحوں کی جنت کا نام ہانگ کانگ ہے کیا ہم کراچی شہر کو ہانگ کانگ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ کیا ہم نے اس کے لئے کوئی پلاننگ کی ہے اور کیا ہماری حکومت 5 اور 10 سال تک ٹیکس ہالیڈے و

دیگر مراعات فراہم کر سکتی ہے۔ کراچی کی از سر نو تعمیر کے لئے تمام صنعت کاروں کو آگے آنا چاہئے۔ اگر کراچی خوشحال ہوگا تو پاکستان خوشحال ہوگا۔ اللہ سے میری دعا ہے کہ کراچی کو خوشحال بنانے کے لئے حکومت کے منصوبہ کو نظر بد نہ لگے۔ اور خود حکومت بھی محتاط اور صنعت کاروں اور عوام کے اشتراک سے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کر دے۔ آمین

29th April, 2001

اے آر ڈی کا جلسہ

آج کے اخبار کی اطلاعات کے مطابق حکومت سندھ نے یکم مئی کے ہونے والے اے آر ڈی کے جلسے کو روکنے کے لئے 800 افراد کو گرفتار کرلیا جس میں تمام سربراہان، عہدیداران اور کارکنان شامل ہیں اور دعویٰ کیا کہ وہ کراچی میں کسی صورت میں جلسۂ عام نہیں ہونے دیں گے۔ دوسری طرف اے آر ڈی والوں کا اصرار ہے کہ ہم ہر صورت میں کراچی کے جلسۂ عام کو کامیاب بنائیں گے۔ حکومت نے چھوٹے کارکنوں کو تو جیل میں ڈال دیا ہے بڑے بڑے دیگر صوبے کے سربراہوں کو کراچی بدر کردیا ہے۔ درمیانی عہدیداران اور کراچی کے سربراہان کو گھر میں نظر بند کردیا ہے اور ان کی گرفتاریوں کے بارے میں یہ بھی اطلاعات آئی ہیں کہ پولیس اپنے ساتھ K.E.S.C. کی سیڑھیوں والی گاڑیاں لے کر گئی اگر کسی نے آنے میں دیر کردی تو فوراً پولیس نے دیوار سے سیڑھی لگا کر مکان میں اتر کر زبردستی مکان کی تلاشی بھی لی اور گھر والوں کو ہراساں بھی کیا۔ توڑ پھوڑ بھی کی وغیرہ وغیرہ۔

عوام یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ حکومت کیوں یکم مئی کے جلسہ نہیں ہونے دینا چاہتی۔ حکومت کا موقف صرف یہ ہے کہ کراچی میں جلسہ نہیں کرنے دیگی۔ اتفاق سے 23 مارچ کو لاہور میں بھی حکومت پنجاب نے یوم آزادی کے موقع پر اے آر ڈی کو جلسہ نہیں کرنے دیا تھا۔ حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے جناب عمر اصغر خان صاحب نے یہاں تک فرمایا کہ اگر 23 مارچ کو جلسہ ہوجاتا تو ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے۔ خوش قسمتی سے میں عمر اصغر خان صاحب کے والد بزرگوار محترم جناب اصغر خان صاحب کی پارٹی تحریک استقلال میں 12 سال جمہوریت کی بحالی کی تحریک میں شامل تھا اور اصغر خان صاحب نے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف الگ الگ اور پھر بعد میں پی این اے کے ساتھ مل کر سیاست کی آزادی اور عوام کو جمہوری آزادی کی

زبردست تحریکیں چلائیں جس کی وجہ سے بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہوئی بعد میں ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ایم آر ڈی کی زبردست تحریک میں جمہوریت کی خاطر کئی بار خود اصغر خان اور عمر اصغر خان اور مجھے بھی جیل جانا پڑا۔ ہمارا نعرہ صرف جمہوریت کی بحالی تھی ہم جلسہ جلوس کرتے تھے اس وقت بھی انتظامیہ طرح طرح کی پابندیاں لگا کر کارکنوں کی گرفتاریاں کرتی تھی۔ لاٹھی چاج کرتی تھی جلسوں کو درہم برہم کرتی تھی تو ہمارا نعرہ یہ ہوتا تھا کہ ہمیں بولنے کی آزادی چاہئے۔ ملک میں ڈکٹیٹری نہیں چلے گی۔ کئی جلسے اور جلوسوں میں عمر اصغر خان صاحب نے بعد میں شرکت کرنی شروع کردی تھی وہ تحریک استقلال یوتھ کے پہلے صدر بھی رہ چکے ہیں انہیں بخوبی علم ہے کہ جمہوریت کو کچلنے سے جمہوریت تو ختم نہیں ہوتی۔ البتہ اس کو ختم کرنے والے آج اس دنیا میں نہیں رہے۔ اتنے صاحب علم اور خاص طور پر جمہوریت کے سب سے بڑے سیاست داں اصغر خان صاحب کے صاحبزادے کے ناتے وہ کیوں جمہوریت اور بولنے کی آزادی کے خلاف سینہ سپر ہوکر اے آر ڈی کے خلاف بیانات دے رہے ہیں گویا اپنے ماضی کی جدوجہد کو خود غلط قرار دے رہے ہیں۔ جبکہ آج ان کا یہ مقام ماضی کی جدوجہد کا ثمر ہے اس درخت کو کیوں جلانا چاہتے ہیں۔ اس جلسہ عام کے خلاف ہمارے وزیر داخلہ محترم معین الدین حیدر صاحب بھی ہیں۔ معین الدین حیدر صاحب سندھ کے سب سے محبوب گورنر رہے ہیں انہوں نے دن رات اس صوبے کی خدمت کی اور بہت نیک نام کمایا۔ لوگوں کے دلوں میں راج کیا۔ بہت تحمل مزاج اور سنجیدگی سے مسائل حل کئے چھوٹے چھوٹے علاقوں کے ان گنت دورے کئے۔ سندھ میں جب سیلاب آیا۔ جا کر خود دیکھ بھال کی۔ ضرورت مندوں میں کروڑوں روپے کی امداد تقسیم کی۔ تحمل مزاجی کی ایک مثال جو میں نے دیکھی وہ تحریر کررہا ہوں۔ میری پہلی کتاب ''شگوفۂ نو'' کی رونمائی میں وہ صدارت کررہے تھے تمام مقررین نے میری کتاب کے حوالے سے تقریریں کیں مگر ایک مقرر نے جذباتی ہوکر سیاسی تقریر کی اس پر کچھ نے تالیاں بھی بجائیں اور کچھ نے برا مانا کہ یہ بھلا کون سا سیاسی پلیٹ فارم ہے۔ معین الدین حیدر صاحب نے ان کی تقریر سنی اور نوٹ پر نوٹ لکھتے گئے آخر میں جب وہ صدارتی تقریر کرنے آئے تو انہوں نے ان مقرر کے ایک ایک جملے کے جوابات دیئے اور دلائل سے قائل کیا عوام سے زبردست داد وصول کی غصہ اور جذبات سے کام نہیں لیا۔ مجھے ہی نہیں تمام حاضرین جلسہ جس میں کراچی کی بہت بڑی شخصیات اس رونمائی کے لئے جمع تھیں بہت متاثر کیا۔

پھر حال ہی میں جنگ گروپ کی تقریب انعامات برائے طلبہ وطالبات میں دوبارہ میں نے دیکھا کچھ مقررین نے اور ایک ہمارے صحافی عطاالحق قاسمی صاحب نے خوبصورت مقالہ پڑھا حالانکہ وہ مقالہ موجودہ حکومت سے چھیڑ چھاڑ کا بھی تھا۔ ایک اور مقرر صاحب نے سیاسی تقریر کی۔ دونوں کی تقریریں جب ختم ہوئیں تو خود معین الدین حیدر صاحب جو اس تقریب کی صدارت کر رہے تھے تالیاں بجا کر داد دی اور اپنی تقریر میں حسب عادت بڑے بڑے دلائل دیئے اور عوام سے داد وصول کی۔ میری سمجھ سے بالاتر ہو رہا ہے کہ آخر کیا بات ہے کہ ہمارے وزیر داخلہ صاحب اس جلسہ عام سے کیوں الرجک ہیں۔ کہیں وہ اپنے مشیروں کی غلط باتوں میں تو نہیں آ گئے؟ اتنے ٹھنڈے مزاج سے جمہوری طریقے سے سوچنے والے معین الدین حیدر صاحب بھی بیوروکریسی کی چال میں آ گئے تو یہ المیہ ہوگا۔ ہر شخص کو بولنے کی آزادی ہوتی ہے خواہ وہ ہوٹلوں میں چند سو افراد کی نشست ہو یا جلسہ عام کی شکل میں ہو۔ کیا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا اگر ایک جلسہ ہو گیا؟ بھلا آج 800 افراد گرفتار کر کے کیا حکومت کو بدنام کرنے کی سازش نہیں تو اور کیا ہے۔ روزانہ گرفتاریاں ہونگی گھروں پر چھاپے مارے جائیں گے۔ ہفتہ بھر پولیس پورے صوبے میں بالخصوص کراچی میں ہنگامہ آرائی میں مصروف ہوگی جبکہ اے آر ڈی والے کہہ رہے ہیں ہم پرامن جلسہ کرنا چاہتے ہیں۔ یکم مئی یوم مزدور بھی ہے اور چھٹی کا دن بھی۔ لہٰذا ہم کو کراچی میں جلسہ کرنے دو ہم امن کو خراب نہیں کرنا چاہتے بلکہ اگر انتظامیہ امن برقرار رکھنا چاہتی ہے تو ہمیں جلسہ کرنے کی اجازت دے دیں۔ ہم ضمانت دیتے ہیں کہ کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا صرف اور صرف جلسہ ہوگا۔ انتظامیہ بضد ہے کہ نہیں ہنگامہ ہوگا۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے ایک پولیس والا ایک شخص کو گرفتار کرنے اس کے گھر پہنچا اس پر شبہ تھا کہ وہ شخص کمیونسٹ ہے اس شخص نے کہا بھائی میں کمیونسٹ نہیں ہوں بلکہ اینٹی کمیونسٹ (Anti-Communist) ہوں۔ پولیس والا بولا پہلے تو مجھے شبہ تھا مگر اب تو تم خود قبول کر رہے ہو اور اپنے نام کے آگے کمیونسٹ بھی لگا رہے ہو چلو سیدھے گاڑی میں بیٹھو۔

میرا حکومت کو یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ جب اس حکومت کو سپریم کورٹ سے 3 سال مل چکے ہیں۔ یہ سیاست داں کوئی تخریب کار نہیں۔ غدار وطن نہیں ہیں۔ جلسہ کرنا کوئی غیر جمہوری اقدام نہیں ہے۔ خود حکومت بھی جمہوریت کی دعویدار ہے اس مسئلے کو انا کا مسئلہ نہ بنائے ان کو عوام کے سامنے جانے دیا جائے بولنے کی اخلاقی آزادی دیدی جائے آپ جس تحریک کو جتنا دبائیں گے اور کچلنے کی کوشش کریں گے اتنی ہی وہ تحریک

مقبول ہو کر ترقی کرے گی اور ماضی کی حکومتوں کی طرح جڑیں پکڑینگی۔ پہلے ایک شہر سے شروع ہوگی پھر پھیلتے پھیلتے دوسرے شہروں میں چلی جائے گی پہلے امن پسند سیاست دانوں کے ہاتھ میں ہوگی پھر نکل کر جذباتی سیاست دانوں کے ہاتھ چلی جائیگی اس طرح شر پسندوں کو موقع ملے گا پھر وہی توڑ پھوڑ ہوگی۔ ہڑتالیں ہوں گی، گھیراؤ جلاؤ، پہیہ جام ہوگا۔ پہلے ہی ہماری معاشی حالت خراب ہے صنعت سازی بند ہے مزید قوم کا نقصان ہوگا۔ سیاست دانوں کو پابند کیا جائے کہ جلسہ پرامن ہونے کی ضمانت لے کر اسے کرنے دیں اور حکومت کی بدنامی نہ کروائیں جمہوری طریقے کو اپنائیں۔ دو بھائیوں کے اختلافات کو ہوا نہ دیں۔ امید ہے حکومت اس پر مثبت اقدام کرے گی اور شر پسندوں کو موقع فراہم نہیں کرے گی۔

11th May, 2001

ٹی وی چینلوں کی یلغار

ہمارے معزز کالم نگار عبدالقادر حسن صاحب کا ایک کالم ''زی ٹی وی پاکستان میں'' کے عنوان سے میری نظر سے گزرا جس میں انہوں نے پی ٹی وی کے مینجنگ ڈائریکٹر یوسف بیگ مرزا پر الزام عائد کیا کہ وہ زی ٹی وی کلچر پاکستان میں پی ٹی وی کے پلیٹ فارم سے گزشتہ کئی سالوں سے فحش پروگرام نشر کر رہے ہیں اور ہماری قوم کا مزاج تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ناظرین کو مایوس کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ جتنے ماہ مجھے کالم لکھتے ہوئے ہو گئے ہیں اس سے کہیں زیادہ سال سے محترم عبدالقادر حسن صاحب کالم لکھ رہے ہیں۔ عوام اور میں خود ان کے کالموں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ اور اکثر کالم قوم اور ملک دونوں کے لئے اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ممکن ہے صحافت اور تجارت دو الگ الگ مقام رکھتی ہیں ضروری نہیں جو صحافت میں سوچا اور سمجھا جائے۔ وہ تجارت میں بھی وہی مقام رکھے یا یوں کہیئے صحافی کامیاب تاجر نہیں ہو سکتا اور تاجر ضروری نہیں کہ کامیاب صحافی ہو یا دونوں کا تجربہ ایک جیسا ثابت ہو۔

میں نے بحیثیت صنعت کار پی ٹی وی کے ادارے کو ہمیشہ غیر تسلی بخش پایا تھا جو عوام کو 24 گھنٹے میں صرف ایک گھنٹہ صحیح تفریح مہیا کرتا تھا اور سارا دن حکومت وقت کا راگ الاپتا تھا۔ خبریں بے جان اور حکومت وقت کا قصیدہ ہوتی تھیں۔ وزیراعظم نامہ پھر وزیر نامہ اور آخر میں حکومت کا کارنامہ ہوتا تھا۔ ایک آدھ خبر آ جائے تو آ جائے۔ ملک میں کوئی حادثہ ہو تو اس کی خبر گول ہو جاتی تھی اور کشمیر اور بھارت میں اگر کسی کو چھینک آ جائے تو مجال ہے کہ وہ خبر پی ٹی وی پر نہ دکھائی جائے۔ بھارت کے گاؤں میں ہڑتال ہو گئی تو بڑی بڑی تصاویریں اور خبریں جبکہ پاکستان کے شہروں میں اگر ہڑتال ہو تو ایک دن پہلے کھلی دکانیں دکھا کر صاحب اقتدار کو خوش کرنا ہی اس کی پالیسی تھی۔ جب تک زی ٹی وی نہیں آیا تھا۔ من مانے داموں پر اشتہار لئے جاتے تھے۔ اپنی اپنی

پسند کے اداکاروں پر انعامات کی بارش ہوتی تھی۔ جس نے بھی ٹی وی سے اختلاف کیا وہ ٹی وی سے باہر اور جو صبح سے شام تک ٹی وی کی ہاں میں ہاں ملائے اس کو ٹی وی پر بلا کر پروجیکشن دیا جاتا تھا۔ خواہ پی پی پی کا دور ہو یا مسلم لیگ کا ایک رات میں اقتدار سے الگ ہونے والے کو دوسرے دن مطعون کیا جاتا۔ عجب انقلاب دیکھنے میں آتا تھا گویا پاکستان ٹیلی ویژن نہیں بلکہ صرف اور صرف وزیراعظم کو خوش رکھنا ہی اس کا کام تھا اور اتنی بڑی چودھراہٹ اور اجارہ داری کے باوجود ہر سال کروڑوں کا خسارہ اس کا مقدر ہوتا تھا۔ حزب اختلاف کا ذکر گویا حزب اقتدار کے لئے ناقابل معافی تھا۔ نہ عوام خوش تھے نہ اشتہارات دینے والے خوش تھے۔

پھر ہندوستان میں نئے ٹی وی نے جنم لیا جس کو زی ٹی وی کا نام دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کے ٹیلی ویژن اور ہندوستان کے دوردرشن کا اقتدار ڈاواں ڈول ہونے لگا۔ عوام زی ٹی وی کی طرف متوجہ ہونے لگے اور پھر آہستہ آہستہ نئے ٹی وی چینل آنے لگے۔ ہمارے ہاں بھی NTM کا اضافہ ہوا۔ مگر ہم کافی پیچھے جانے لگے۔ عوام کو پتہ چلا کہ کیمرہ کے کیا کیا کمالات ہیں۔ ہمارے کیمرے دھندلے ہوتے گئے اور بھارتی پروگراموں نے جگہ بنانی شروع کر دی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں۔ ہے کہ بھارتی ٹی وی سے عریانی اور فحاشی نے جنم لیا مگر آج آپ کسی کو نہیں روک سکتے اور آنے والا کل اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ عوام نے تو پی ٹی وی ہی دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ جہاں جہاں کیبل اور ڈشیں داخل ہوتی گئیں وہاں وہاں بھارتی میڈیا چھاتا گیا اور اب صرف گاؤں گوٹھوں میں جہاں جہاں کیبل یا ڈشیں نہیں پہنچ سکی تھیں وہاں پی ٹی وی ایک مجبوری کے طور پر دیکھا جانے لگا تھا۔ میرے خیال میں آج کے زمانے میں ماڈرن ہونا کوئی بری بات نہیں ہے، اچھا لباس ہو، عریانیت نہ ہو اچھے اور ماڈرن ڈراموں کی ضرورت تھی۔ اس خلاء کو پر کرنے کے لئے جب نوجوان یوسف بیگ کا نام سامنے آیا تو ٹی وی کروڑوں کا مقروض تھا۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے اس کا معیار بڑھایا ساتھ ساتھ پرائیویٹ پروڈکشن شروع کروائی۔ نئے نئے چہرے سامنے آئے ٹی وی کو جدید آلات دلوائے۔ اشتہارات پر جو بے جا پابندیاں تھیں وہ ختم کیں۔ اسی طرح ڈراموں پر کھل کر تعمیری اور تنقیدی مکالمے دکھائے گئے۔ عوام دوبارہ پی ٹی وی کی طرف لوٹے۔ کیونکہ ہمارے ٹی وی کے ڈرامے کافی معیاری تھے اور اب تو پرائیویٹ پروڈکشن کی وجہ سے ان کا معیار بہتر سے بہتر ہوتا گیا۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا کہ ہمارے 90 فیصد اشتہارات زی ٹی وی پر آ چکے تھے۔ مگر آج زی ٹی وی پر خال خال ہمارے ملک کے

اشتہارات رہ گئے ہیں۔ جو اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ لوگ زی ٹی وی پر یا دوسرے چینل پر اچھے پروگرام تو دیکھتے ہیں مگر ساتھ ساتھ ہمارے ٹی وی پر ان کی گرفت دوبارہ مضبوط ہو رہی ہے اور ٹی وی جو کروڑوں روپے کا مقروض تھا اور نقصان میں جا رہا تھا اب اس کمی کو پورا کر رہا ہے۔ اس نے نہ صرف پرانے نقصان کو پورا کیا بلکہ اشتہارات نئے نئے زاویوں سے دکھا کے قومی دولت میں اضافہ کیا۔ پھر پی ٹی وی ورلڈ نے پوری دنیا میں بالخصوص ہمارے مسلم برادر ملکوں میں رہنے والے پاکستانیوں میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ یہ سب کچھ یوسف بیگ مرزا کا کریڈٹ ہے نواز شریف سے رشتہ داری کوئی عیب نہیں ہے اور اس موجودہ حکومت کے دور میں بھی ان کو ٹی وی سے الگ نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ کرپشن میں یا سابقہ حکومت کی غلط پالیسیوں کے حصہ دار نہیں بنے۔ ان کا اور سابق وزیر اطلاعات کا ہمیشہ ٹکراؤ رہتا تھا۔ خود خبرنامہ پہلے کی نسبت کافی مثبت تبدیلیاں لاتا رہا ہے کہ اب تو حزب اختلاف کو بھی ٹی وی پر بلا کر مذاکرہ کرایا جاتا ہے، آخر ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ چینل UTN بھی تو آ چکا ہے اس پر بھارتی اور پاکستانی دونوں ملکوں کے پروگرام دکھائے جا رہے ہیں۔ اردو کو فروغ دیا جا رہا ہے اور دونوں ملکوں کے عوام اس چینل سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایسے میں اگر پاکستانی دھنوں کی نقل کو پی ٹی وی سے دکھا کر بھارت کے نقل خوروں کو دکھانا کونسا معیوب کام ہے کہ اس سے ہمارے موسیقاروں کا درجہ بڑھے گا اور بھارت کی اس کھلی چوری کو بے نقاب کرنا کہ ہمارے موسیقاروں کی دھنوں کو چرا کر اپنے ملک کو اچھے گانے والوں کا کریڈٹ دینا اتنی ہی بددیانتی ہے۔ آج پوری دنیا کو معلوم ہو رہا ہے کہ فلاں گانا ہمارا تھا۔ فلاں دھن ہماری تھی گویا ہم ان سے بہتر ہیں۔ خود بھارتی موسیقاروں نے ہمارے مرحوم استاد نصرت فتح علی خان کی مشہور قوالی دم مست قلندر مست مست کو جس بے ہودگی سے چوری کر کے ''تو چیز بڑی ہے مست مست'' کا گانا بیہودگی سے پکچرائز کیا ان موسیقاروں کو ننگا کرنا اور اب تو انہوں نے دھنیں اور گانے چوری کرنے کی لائن ہی لگا دی تو پوری دنیا کو بتانا اچھا اقدام ہے کہ ہم کو تنقید کرنے کا بڑا ہی شوق ہے مگر کسی کے اچھے اقدامات کی پذیرائی کرنا ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔ ورلڈ ٹریڈ آرڈر (WTO) جس کا نفاذ 2005ء میں پوری دنیا پر لاگو ہو جائے گا جس کی رو سے ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں بلا تخصیص آ جا سکے گا پوری دنیا ایک ہو جائے گی۔ کوئی کسی کو نہیں روک سکے گا۔ اجارہ داری (Monopoly) ختم ہو جائے گی۔ اس آنے والے وقت کے لئے ہم نے کیا تیاری کی ہے۔ ہم آرام سے سو رہے ہیں۔

بھارت اور چین کا جب سستا مال اور ان کے چینل پوری دنیا میں چھا چکے ہوں گے۔ تب ہم جاگیں گے کس کس کا مقابلہ کریں گے۔ اول تو ہمارا دیار غیر میں پاکستانی ہونا کوئی اچھا تاثر نہیں دیتا۔ بھارت کے صنعتکار اپنے معیار اور کم قیمت کی وجہ سے ہم سے کہیں آگے جا چکے ہیں۔ ہم کو کل کی کوئی فکر نہیں ہے کہ ہماری معیشت دن بدن نیچے کی طرف جا رہی ہے کہ بحیثیت قوم ہم کو اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہوگا۔ کس کس چینل کو آپ بند کریں گے۔ کس کس چینل سے اپنے بچوں کو بچائیں گے۔ ایک یلغار آنے کو ہے۔ اپنے عوام کو بہتر تفریحی پروگرام دکھائیں اور پی ٹی وی کے علاوہ بھی پاکستان کی طرف سے نئے نئے چینل آنے چاہئیں۔ اس کے لئے حکومت پاکستان اس کا بندوبست کرے۔ اکیلا پی ٹی وی یا پی ٹی وی ورلڈ بھارتی پروپیگنڈے اور ان کے پروگراموں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

18th May, 2001

خوشحال پاکستان کیسے ممکن ہے

آئی ایم ایف کے وفد نے کراچی چیمبر آف کامرس کے نمائندوں سے ملاقات میں بتایا کہ ٹیکس سروے اسکیم پر جبری عمل درآمد کرنے سے پاکستان سے زبردست سرمایہ بیرون ملک منتقل ہوگیا ہے یہ سرمایہ خود پاکستانی صنعت کاروں، تاجروں نے منتقل کیا ہے۔ ٹیکس سروے کے نتائج بھی منفی ثابت ہوئے جس کی وجہ سے وصولیابی کا ہدف بھی پورا نہیں ہوا۔ میں نے 12 اکتوبر کے بعد جب فوجی حکام سے ڈیفالٹروں سے لوٹی ہوئی رقم اور ٹیکس سروے شروع کرنے کا عندیہ دیا تھا تو اس وقت بھی میری رائے یہی تھی کہ اس سے فائدہ ہونے کے بجائے نقصانات کے امکانات زیادہ ہیں۔ اول تو ڈیفالٹرز صرف ان وارداتوں میں تنہا نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ بینکوں کے عملے بھی ملے ہوئے تھے۔ ان کی سرپرستی خود اس وقت کے حکمران صوبائی اور مرکزی وزراء سینیٹ کے اراکین سب کے سب ملے ہوئے تھے۔ اگرچہ ان میں چند کیس اصل (Genuine) بھی تھے جو ہماری فارن ایکسچینج پالیسیوں اور ڈالر کی قیمتوں میں اضافے کے باعث ناقابل عمل ہونے کے ساتھ ساتھ بینکوں کی شرح سود زیادہ ہونے کی وجہ سے سرمایہ ڈوب گیا تھا۔ اس وجہ سے بہت سے کارخانے نہیں لگ سکے۔ کچھ کی عمارت اور مشینری کم سرمایہ کی وجہ سے بھی نہیں چل سکی اور وہ عمارتیں اور مشینری کھنڈر اور زنگ میں تبدیل ہوگئیں جواب نیلام کرکے وصولیابی کی جارہی ہیں۔ مگر سب مل ملا کر وہ 15 فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ خود نیب نے جو رقمیں وصول کی ہیں۔ وہ بھی دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان کے وصول کرنے کا طریقہ کار بھی غلط تھا۔ ایک رات میں پندرہ سال کے ڈیفالٹروں سے رقوم کس طرح وصول کی جاسکتی ہیں۔ اس کے لئے مناسب وقت اور اقساط ضروری تھیں۔ اس سے فوج کی بدنامی بھی ہوئی اور قرضے بھی وصول نہیں ہوسکے۔ اوپر سے سرمایہ کاری ختم ہوگئی۔ اگر ان صنعتوں کو چلنے دیا جاتا اور آسان اقساط میں

وصول کرنے کا کاروباری طریقہ اپنایا جاتا تو بیشتر افراد اس طریقہ کار کی وجہ سے قرض واپس کردیتے۔ مگر جب ان کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا تو پھر کیا باقی رہ گیا آج بھی وہ جیل میں ہیں اور کوئی بھی (اکا دکا) قرضوں کو لوٹانے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور پھر بہت سے کیسز میں تو بینک دوتہائی رقم تو سود کے نام پر وصول کرچکے ہیں۔ جبکہ اصل رقم جوں کی توں ہے کہ بھلا سرمایہ کار جیل میں رہتے ہوئے کہاں سے رقم جمع کرائے گا۔ اب تو ڈیڑھ سال کا عرصہ بھی گزر چکا ہے اور کتنے سال جیل میں رکھا جائے گا۔ سرمایہ کاری کو سب سے بڑا نقصان پی پی پی کے پہلے دور میں پہنچا تھا۔ جب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے راتوں رات تمام بڑے بڑے اداروں جن میں بینک، انشورنس، اسٹیل کے کارخانے، کاٹن سے متعلق اور بڑے بڑے کارخانے نیشنلائز کرلئے اور ان کے مالکان کو کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا گیا۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے صنعت کار جنہوں نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں زبردست صنعتی انقلاب برپا کیا تھا وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے اور دیار غیر میں جاکر دوبارہ ان ممالک میں نئے کارخانے لگالئے اور اس طرح بڑی صنعتیں لگنی بند ہوگئیں۔ سوائے انشورنس اور بینک کے تمام ادارے سرکاری تحویل میں جانے کے بعد نفع کے بجائے نقصانات کرتے رہے جس جگہ دس افراد کام کرتے تھے۔ اسی جگہ پچاس افراد بھرتی کئے گئے اور وہ بھی اپنی اپنی پسند اور سیاسی کارکنان کو کھپا دیا گیا جو صنعتکاری کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھے۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ خسارہ ہی خسارہ ہوتا گیا۔ حکومت نوٹ چھاپتی رہی اور ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر قرضے دینے والے اداروں سے قرضے لئے گئے۔ پہلے تو انہوں نے آسان شرائط میں قرضے فراہم کئے اور پھر جب ان کی واپسی کا ٹائم ٹیبل سامنے آیا تو ہم سب کچھ اصلی قرضے کھاپی کر برابر کرچکے تھے۔ ہم نے سرمایہ کاری صنعتوں میں کرنے کے بجائے اپنے شاہی اخراجات پر لگادی تھی۔ بڑے بڑے محلات، وزیراعظم ہاؤس، ایوان صدر اور بڑی بڑی شاندار سرکاری عمارتیں بنانے پر خرچ کرڈالی۔ اسلام آباد آج کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پیٹرول، گیس اور بجلی جو پہلی ضرورت سمجھی جاتی ہے، صنعت سازی میں اس پر توجہ دینے کے بجائے دن رات اس کے دام بڑھانے پر لگادیئے۔ سال میں پہلے ایک بجٹ آتا تھا پھر تین چار ماہ بعد منی بجٹ آنے لگا۔ پھر ماہانہ بجٹ آنے لگا۔ ہر ماہ پیٹرول، بجلی، گیس کے نرخ بڑھنے لگے۔ سرمایہ کاری تو رکی ہوئی تھی اب نجی شعبہ بھی ہاتھ سے جانے لگا اس پر بس نہیں چلا تو اپنے ہی روپے کی قدر گھٹانی شروع کردی۔ دس روپے کا ڈالر ہر صبح بڑھنا شروع ہوگیا اور بڑھتے بڑھتے آج 65 روپے

تک پہنچ گیا۔ ستم ظریفی تو دیکھئے چالیس روپے میں سو بنگلہ دیشی ٹکے ملتے تھے۔ پھر مدتوں ایک کے بدلے دو ٹکے ملتے رہے۔ بنگلہ دیشی اپنی صنعتوں میں سرمایہ لگاتے گئے اور آج ان کا ڈالر ہم سے بہتر ہو گیا اور صرف 45 ٹکے پر آ گیا۔ اور ہمارا روپیہ دو ٹکے کا ہو کر رہ گیا۔ اب یہ ہی سرمایہ فراہم کرنے والے ہمیں آنکھیں دکھا دکھا کر اور سخت سے سخت شرائط پر قرضے دینے کے لئے مشکل سے آمادہ ہوتے ہیں اور ایک ہم ہیں آج بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ہم اسی عیاشی اور شاہ خرچی میں ملوث ہیں۔ قرضے لینے کے لئے اپنی قیمت اور عزت گروی رکھ دی ہے کہ اپنے ہی اسٹیٹ بینک کی عمارت میں ایک فلور ان کو دے دیا ہے۔ روپیہ ہمارا حکم ان کا معیشت ہماری قبضہ ان کا۔ بجٹ ہمارا عمل درآمد ان کا ان کی مرضی کے بغیر اب ہم کوئی چیز نہ ایکسپورٹ کر سکتے ہیں اور نہ ہی امپورٹ کر سکتے ہیں اور تو اور اب ہم نے ان کو اپنی سرزمین بھی بیچنی شروع کر دی ہے کہ اب وہ ہمارے لئے اجناس اگائیں گے۔ جس ریٹ پر چاہیں گے ہمارے ہاتھ فروخت کریں گے اور جب چاہیں گے ایکسپورٹ کر کے اپنا سرمایہ نکال کر چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ ان کی کالونیاں بن گئیں۔ پھر قصبے آباد ہوں گے اور ایک وقت آئے گا ان کے نام کے شہر آباد ہونا شروع ہو جائیں گے۔

جب صنعت کاری ختم ہو گئی تو نجکاری شروع ہو گئی۔ آج پاکستان معیشت کے جس بحران میں کھڑا ہے خود ہماری صنعتوں کو خریدار نہیں مل رہے ہیں۔ اونے پونے بیچنے شروع کر دیئے ہیں۔ غیر ممالک کے بینکوں کی یلغار ہو چکی ہے۔ ہمارے نجی بینک یا تو بند ہو رہے ہیں یا پھر ضم ہو رہے ہیں۔ روز ایک بینک کا فراڈ سامنے آتا ہے لوگ چند دن روتے ہیں چلاتے ہیں۔ پھر خاموش ہو کر اپنے اپنے کاروبار میں لگ جاتے ہیں۔ کب تک ہماری آنکھیں بند رہیں گی۔ ہمارے پڑوسی کی ہم پر خاص نظر ہے، اس نے اپنے ملک میں سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک بنانے کے بنیادی کارخانے لگا دیئے ہیں۔ وہ اپنی شرائط پر قرضے لیتا ہے۔ ہم ان کی شرائط پر قرضوں کا انحصار کرتے ہیں۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ آئی ایم ایف یہ کہہ رہا ہے وہ کہہ رہا ہے۔ اس کے دام بڑھاؤ یہ ٹیکس لگاؤ۔ جی ایس ٹی لگاؤ۔ انکم ٹیکس سروے کرواؤ۔ معاشرہ کو ٹیکس پر ٹیکس لگانے پر الجھائے رکھو۔ مگر آج تو الٹا آئی ایم ایف نے یہ کہہ کر پول کھول دی کہ ٹیکس سروے سے سرمایہ کاری ختم ہو گئی ہے کہ اور سرمایہ باہر منتقل ہو گیا ہے۔ اب کیسے اس سرمایہ کو ہم واپس لائیں۔ اب بھی وقت ہے، سرمایہ کاری کے لئے بڑی بڑی ترغیبیں دی جائیں۔ سرمایہ اور سرمایہ دار کو سب سے پہلے تحفظ فراہم کیا جائے۔

ٹیکس ہالیڈے کا اعلان کیا جائے۔ بیرون ملک ڈالر لانے پر پہلے کی طرح کوئی پوچھ گچھ نہیں ہونی چاہئے۔ پھر ڈالر کھلی مارکیٹ کے بھاؤ خریدا جائے۔ اگرچہ حکومت نے پھر سرمایہ باہر لیجانے پر سے پابندی اٹھالی ہے مگر بھیجنے کے لئے شرائط بہت سخت ہیں۔ کھلی منڈی میں ڈالر اور دوسری کرنسیوں کے لانے اور لے جانے پر کوئی پابندی یا شرط نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ڈالر لانے والوں کو انعامی اسکیمیں چلانی چاہئیں۔ فارن کرنسی اکاؤنٹ بین الاقوامی قواعد پر چلانے چاہئیں۔ پوری دنیا کے بینکوں کے آن لائن اکاؤنٹ سے ملا دینے چاہئیں اور اسٹیٹ بینک کا فارن کرنسی اکاؤنٹ اور ڈالروں کو اسٹیٹ بینک میں جمع کرانے کی شرائط ختم کرنے سے دوبارہ صنعتکاروں کو یقین آئے گا۔ صنعتکاروں اور تاجروں کی حکومت کے اداروں سے مشاورت ہونی چاہئے۔ دنیا بھر میں اسٹاک ایکسچینج، چیمبر آف کامرس اور فیڈریشن کے مشوروں سے ہی ملک کی پالیسیاں بنتی ہیں۔ مگر ہم نے صرف ان کو بلانے تک محدود کر رکھا ہے ہمارا بیوروکریٹ ان کی شرائط اور مشورے سن تو لیتے ہیں۔ مگر بجٹ اور معیشت اپنے ہی طور طریقہ سے چلاتے ہیں۔ جب تک چیمبر آف کامرس اور فیڈریشن کے نمائندوں کی عملی مشاورت اور نمائندگی حکومت کے ایوان میں نہیں ہوگی اور انقلابی تبدیلیاں نہیں لائی جائیں گی۔ حکومت کے کارندوں کے صوابدیدی اختیارات ختم کر کے ایک پالیسی نہیں بنائی جائے گی اس وقت تک ہمارے ملک میں صنعتکاری نہیں ہو سکتی۔ بجٹ کا زمانہ آ رہا ہے حکومت کو چاہئے چیمبر آف کامرس اور فیڈریشن کے نمائندوں کو بلائے اور ان سے کہے کہ آپ بجٹ بنا کر دیں..... پچاس سال تک آپ نے بجٹ مسلط کیا ہے۔ من مانے ٹیکس لگائے ہیں لامحدود اختیارات اپنے پاس رکھے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے تاجروں اور صنعت کاروں کے نمائندوں کے حوالے معیشت کر دی جائے۔ ان کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔ یہی تو وہ صنعتکار ہیں جو آج بھی اس خوفناک دور میں اپنی بڑی بڑی صنعتیں چلا رہے ہیں۔ آج بھی پاکستان میں رہ کر سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ یقیناً یہی لوگ ہیں جو ہم کو اس بحران سے نکال سکتے ہیں۔

ہر بڑی صنعت سے وابستہ افراد میں سے قابل اور محبِ وطن شخصیتوں کو اپنے مشیروں میں شامل کیجئے۔ یاد رکھئے جب تک معیشت بحال نہیں ہوگی۔ ہم قرضوں پر ہی انحصار کرتے رہیں گے۔ شاہ خرچی پر کنٹرول کیجئے۔ تعلیم عام کیجئے قرضوں کو ادا کرنے کے انتظامات کیجئے اور نئے قرضے لینے سے گریز کیجئے جب جا کر خوشحال پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔

25th May, 2001

ٹھنڈا کالم

آج کل پورے پاکستان میں گرمی عروج پر ہے۔لوگ پانی پانی چلا کر پانی پانی ہو چکے ہیں ہر طرف اس کا واویلا ہے،تو دوسری طرف بجلی کی آنکھ مچولی حسب ضرورت جاری ہے۔ پہلے بجلی مکمل طور پر چلی جاتی تھی۔ لوگ شور کرتے تھے۔اس کا علاج بجلی کے کرتا دھرتاؤں نے یہ نکالا کہ لوڈ شیڈنگ کے بجائے لوو وولٹیج (Low Voltage) کر دیا ہے،جس سے کم از کم پنکھے اور بلب جلتے رہتے ہیں اور ایئر کنڈیشنر وغیرہ بند ہو جاتے ہیں چلو کچھ تو عوام کو ریلیف دینے کا خیال آیا دوسری طرف ہماری معیشت پر بے روزگاری کے سبب زبردست زوال ہے،عوام مہنگائی سے اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی چیز سستی مل جائے تو اس کو اصلی نہیں سمجھتے یا پھر چوری کا مال سمجھ کر نہیں خریدتے یوٹلیٹی اور ٹیکسوں کو بھرتے بھرتے عوام کی کمر ٹوٹ چکی ہے،ایسے میں میں نے سوچا کہ آج کا کالم عوام کے اس غمزدہ چہروں پر کچھ مسکراہٹ لانے کا سبب بن جائے تو کم از کم کچھ دیر کے لئے تو اچھا وقت کٹ جائے گا۔اسی لئے آج ٹھنڈا کالم لکھ رہا ہوں۔

آج کل مسلم لیگ والوں پر حکومتی دباؤ کچھ زیادہ ہے۔اس لئے ایک طرف تو ہم خیال مسلم لیگی ان کو ستانے پر لگے ہوئے ہیں تو دوسری طرف خود وہ حکومت کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔مگر شاباش ہو مسلم لیگیوں پر اتنے ٹکڑے ہونے کے باوجود وہ میدان سیاست میں ڈٹے ہوئے ہیں۔جس کا جب اور جہاں بس چلتا ہے وہ بیان بازی میں ہرگز پیچھے نہیں ہے۔میں اخبار کے چند ٹوٹے جمع کر کے ان بیانات کو نقل کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔شاید ہمارے قارئین کو ان پر تبصرہ پسند آئے۔

خبر کا ٹوٹا یہ ہے کہ میاں نواز شریف کا جہاز جلد ہی پاکستان میں لینڈ کرنے والا ہے۔

تبصرہ: پاکستان سے جس جہاز میں وہ گئے تھے ابھی تک لینڈ نہیں ہوا۔نواز شریف کو سیاست سے کوئی

آؤٹ نہیں کر سکتا (پروفیسر ساجد میر)۔

تبصرہ: اگر وہ آؤٹ نہیں تو کہاں پائے جاتے ہیں۔

قربانیاں دینے والوں کو ہرگز فراموش یا نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔(جاوید ہاشمی)

تبصرہ: بیان دینے سے پہلے ہاشمی صاحب میاں اعجاز شفیع سے تو پوچھ لیتے

میں راولپنڈی کے حلقے سے بلدیاتی انتخاب لڑ کر ناظم بن جاؤں گا (شیخ رشید)۔

تبصرہ: کیا ایجنسیوں سے ''ڈیل'' ہو گئی۔ویسے دوسرے تمام بلدیات سے مسلم لیگ آؤٹ ہو چکی ہے۔

ایک صاحب کثرت اولاد کے نقصانات پر زبردست تقریر کر رہے تھے یہ نہ کرو اور یہ کرو۔بڑی دھواں دھار تقریر کر کے جب وہ واپس اپنے دوست کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جانے لگے تو ان کے دوست نے کہا یار تم خود اس کے نقصانات گنوا رہے تھے جبکہ تمہارے 12 لڑکے لڑکیاں ہیں وہ صاحب بولے۔اسی لئے تو ان سب کو آگاہ کر رہا تھا کہ جو غلطی میں نے کی ہے وہ تو نہ دہرائیں۔

نوابزادہ نصر اللہ خان آج کل کافی بیمار ہیں۔ڈاکٹروں نے ان کو زیادہ محنت کرنے اور حقہ پینے پر پابندی لگائی تو وہ بولے تمام زندگی صرف حقے نے میرا ساتھ دیا ہے میں اس عمر میں اس سے بیوفائی نہیں کر سکتا۔

تبصرہ: میاں صاحب کی آخری بیوفائی نے ہی نوابزادہ صاحب کو اب بیوفائی سے روکا ہے۔

وزیر اعظم واجپائی نے پرویز مشرف کو ڈائریکٹ مذاکرات کی دعوت دے دی۔

تبصرہ: ایسی ہی دعوت انہوں نے میاں نواز شریف کو بھی دی تھی۔

ہم خیال مسلم لیگ سے کرپٹ کلچر کا خاتمہ کر دیں گے۔(پرویز الٰہی)

تبصرہ: یہی بات مسلم لیگ والے کہہ چکے ہیں کہ ہم نے مسلم لیگ سے کرپٹ کلچر کا خاتمہ کر دیا ہے۔اللہ ہی جانے کون بشر ہے۔

سیاست سے پابندی ختم کر دی جائے تو پتہ چلے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے (جاوید ہاشمی)۔

تبصرہ: اگر سیاست پر پابندی ہوتی تو آپ کا یہ بیان کیسے چھپتا

قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک ہوتا ہے (ضیاء شاہد)۔

تبصرہ: یہ کہہ کر آپ عوام کی توہین کر رہے ہیں۔

سنی تحریک کے سربراہ کا قتل مولانا شاہ احمد نورانی نے کروایا ہے (فاروق مودودی)۔

تبصرہ: ایسے ہی خیالات اور بیانات کی وجہ سے آپ کو جماعت اسلامی کا کارکن بھی نہیں بنایا گیا تھا۔ ویسے بھی آپ جب بولتے ہیں عجیب بولتے ہیں۔

چکوال میں 95 سالہ بابے کی 14 سالہ دوشیزہ سے شادی کرنے پر بابے کی بیوی اور بابے کی ماں کا واویلا کہ ہم سے بابے کو دور کر دیا ہے (ایک اخباری خبر)۔

تبصرہ: جب بابے کی عمر 95 سال ہے تو بابے کی ماں کی عمر کیوں نہیں لکھی۔

ڈالر 20 پیسے سستا ہو گیا (تجارتی خبر)

تبصرہ: جی ہاں ایک روپیہ اوپر جا کر 20 پیسے نیچے آ گیا ہے خوب پیٹو ڈھنڈورا۔

پی آئی اے کا طیارہ چترال سے پشاور جا رہا تھا کہ فضاء میں ایمرجنسی دروازہ کھل گیا۔ طیارہ پشاور لینڈ کر گیا اور عملے کو خبر تک نہیں ہوئی (اخبار کی خبر)۔

تبصرہ: اچھا ہوا کہ عملہ کو خبر نہیں ہوئی ورنہ بدحواسی میں جہاز گر جاتا۔

میں شادی سے 6 ماہ قبل ہی فلم لائن چھوڑ دوں گی (اداکارہ ریما کا تبصرہ)

تبصرہ: اس وقت تک کیا باقی رہ جائے گا چھوڑنے کے لئے۔

پہلے ٹیسٹ سے پہلے محمد سمیع اور شعیب اختر ان فٹ ہو گئے۔

تبصرہ: پاکستانی عوام کب تک ان کے آؤٹ ہونے کا صدمہ برداشت کریں گے۔

پہلا ٹیسٹ انگلستان نے چار دن میں جیت لیا۔

تاکہ پانچویں دن پاکستانی کھلاڑیوں کی بیویاں اپنے اپنے میاں کے ساتھ لندن میں شاپنگ کر سکیں۔

شکریہ ناصر حسین مہمان نوازی کا۔

فیصل اقبال سائیڈ میچ میں سنچری کے نزدیک۔

پہلے ٹیسٹ میں اس لئے نہیں کھلایا تھا کہ یہ جم جائے گا اور پانچویں دن کی شاپنگ رہ جائے گی۔

جاوید میانداد کو دوبارہ کوچ نہیں بنا رہے ہیں (کرکٹ کے حلقے)

کہیں دوبارہ پاکستان ٹیسٹ جیت کر برابر نہ کر دے اور سٹہ پر لگا سرمایہ نہ ڈوب جائے۔

میرا ہونے والا شوہر زمیندار ہو گا۔ (حمیرا چنا)

آپ گانے میں لگی ہونگی وہ اگانے پر لگا رہے گا۔

پی آئی اے نے ڈومیسٹک کرایوں میں 15 فیصد اضافہ کر دیا جو 15 مئی سے نافذ العمل ہو گا۔

کیونکہ دو ڈومیسٹک ایئر لائنیں بند ہو گئیں تھیں۔ ان کا بوجھ عوام پر اتارنا تھا۔

پاکستان ٹیلی ویژن اب حزب اختلاف کا موقف بھی پیش کرے گا (پی ٹی وی نیوز) تاکہ عوام کا اب حزب اختلاف سے بھی اعتماد اٹھ جائے۔

اگلے بجٹ میں تاجروں اور صنعت کاروں کو زیادہ ریلیف ملے گا۔ بجٹ کے اگلے دن آپ کہاں ہوں گے کیونکہ 51 سال سے ہی یہی سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔

01st June, 2001

خدا کے لئے اب تو سوچیں

دو ہفتے قبل کراچی میں دن دھاڑے سنی تحریک کے سربراہ سلیم قادری اور ان کے ساتھیوں کا افسوسناک قتل ہوا اور ماضی کی طرح آج تک اصلی قاتل نہیں پکڑے گئے، ایک ہفتے تک سنی تحریک کے تنظیمی عہدیدار حکومت سے مطالبہ کرتے رہے کہ سلیم قادری کے قاتلوں کو ابھی تک کیوں گرفتار نہیں کیا گیا، اس قتل میں پہلی مرتبہ ایک ایسے شخص کا قتل بھی شامل ہے جو ایک دوسری تنظیم کا کارکن تھا۔ اس تنظیم کا کہنا ہے کہ قاتلوں نے ہماری تنظیم کے کارکن کو جو اس جگہ سے گزر رہا تھا گولیوں کا نشانہ بنایا گیا مگر سنی تحریک والوں کا دعویٰ تھا کہ یہ شخص بھی قاتلوں میں شامل تھا۔ اور ان کے گارڈ کی فائرنگ سے ہلاک ہوا اس کے ساتھی موقع سے فرار ہوگئے، پولیس نے دوسری تنظیم کے کافی کارکنوں کو ہراساں کیا اور کچھ کو گرفتار بھی کرلیا۔ دس دن گزرنے کے بعد بھی اصلی قاتلوں تک نہیں پہنچ سکی۔ جس کی وجہ سے سنی تحریک نے یکا یک پورے سندھ میں کرفیو کا اعلان کردیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر کوئی بھی شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا، اس کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ ساتھ ساتھ ٹرانسپورٹرز، دوکانداروں اور صنعتکاروں کو بھی یہ دھمکی دی کہ کوئی شخص صبح 6 بجے سے باہر نہیں نکلے اور تمام شہروں میں کرفیو کا نفاذ سمجھا جائے۔ اعلان کے ساتھ ساتھ وہی ہوا کہ شرپسندوں نے 10 گاڑیاں شام ہی سے جلانا شروع کردیں، شہر پھر ایک مرتبہ غیر محفوظ ہوگیا۔ دوسرے دن عملاً کرفیو کا سماں ہوگیا باوجود ٹی وی اخبارات اور تمام سرکاری ابلاغ سے عوام کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ ساتھ ساتھ گورنر صاحب اور وزیر داخلہ صاحب نے قاتلوں کو جلد گرفتار کرنے کی یقین دہانی کرائی اور یہ بھی کہا کہ چند ساتھی پہلے ہی سے گرفتار ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ جاری ہے۔ ہماری پولیس نے روایتی انداز میں شہر کی رینجرز کے ساتھ ملکر صبح سے ناکہ بندی بھی کرلی تھی۔ مگر عوام نے ڈر اور خوف سے ایک دن کی ہڑتال کو ہی عافیت سمجھ کر گھروں میں رہنا ہی بہتر

سمجھا۔ البتہ شام کو کراچی کے عوام سمندر کے ساحل پر امنڈ پڑے اور سمندر سے آنے والے طوفان کا نظارہ کرنے کے لئے بیتاب ہوگئے۔ مگر ایک دن بعد جب دوبارہ سنی تحریک کے باضابطہ ہڑتال کی کال دی تو کاروباری حلقے میں بے حد مایوسی پھیل گئی۔ اور اتنی جلدی دوسری کال پر عوام کا ردعمل منفی پڑا ساتھ ساتھ حکومت کو بھی طیش آ گیا اور انتظامیہ نے بھرپور انداز میں اس ہڑتال کو کچلنے کے لئے اپنی تمام مشینری لگادی، سنی تحریک کے دفتر کو ہر طرف سے سیل کردیا، بجلی کاٹ دی، سینکڑوں کارکن اور عہدیداران گرفتار کرلئے۔ ہر طرف افراتفری بھی پھیل گئی، البتہ شام کو گاڑیاں نہیں جلائی گئیں نہ کوئی ہنگامہ آرائی ہوئی مگر عوام اور ٹرانسپورٹرز گومگو کی حالت میں تھے۔ صبح اخبارات سے پتہ چلا کہ سنی تحریک کے عہدیداران نے حکومت کی یقین دہانی پر ہڑتال کی کال واپس لے لی۔ اور اس طرح صوبے کے عوام نے سکون کا سانس لیا اور لوگ اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر حکومت ہڑتال کے پہلے مرحلے پر ان سے مذاکرات کرلیتی اور یہی یقین دہانی کرادیتی تو بھی کروڑوں روپے کا نقصان نہیں ہوتا۔ گاڑیاں نہیں جلتیں عوام کا ایک دن ضائع نہیں ہوتا ساتھ ساتھ ہمارے طالب علموں کا امتحانات تک جانا اور واپس آنا محال تھا۔ اس کی نظر نہیں ہوتا، خود سنی تحریک کے عہدیداران یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ آج کل ہمارے کاروبار مندی کا شکار ہیں، بیروزگاری عام ہے عوام کی قوت برداشت ختم ہوچکی ہے۔ ڈیلی ویجز (Daily Wages) والے اور ہزاروں ٹھیلے لگانے والوں کو اگر مزدوری نہیں ملی تو ان کے گھر کو فاقوں سے کون بچائے گا۔ مریض ہسپتال جانے کے لئے اگر ٹرانسپورٹروں نے گاڑیاں نہیں چلائیں تو ان مریضوں کی کیا حالت ہوگی۔ کب تک ہماری سوچ اس صدی کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی۔ آج ہی اخبار کی ایک خبر کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یورپ کے ایک ملک فرانس جو پھر سے ایک تہائی ہے اس نے ایک ایسی ٹرین ایجاد کرلی ہے اور ساتھ ساتھ عملی طور پر چلا کر ایک ہزار سے زیادہ فاصلہ یعنی ایک بندرگاہ پیرس سے دوسری بندرگاہ مارسیلز (Marrsalse) تک کا فاصلہ صرف تین گھنٹے اور چند منٹ میں طے کرکے عالمی ریکارڈ قائم کردیا۔ اس بلٹ ٹرین میں انہوں نے عوام کے لئے تمام آرام دہ سیٹیں، کھانے پینے اور سونے تک کا خیال رکھا ہے اور ڈائننگ ہال کی ٹیبل پر انہوں نے ایک گلاس پانی کا لبالب بھر کر بھی رکھ دیا جس میں سے اس سفر کے دوران ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرا۔ میں نے اتفاق سے 1975ء میں اسی بندرگاہ مارسیلز سے پیرس تک سفر کیا تھا اس وقت ٹرین نے ہماری ہی ٹرینوں کی طرح 9 گھنٹے لگائے

تھے۔ ہماری ٹرینیں آج بھی دس گھنٹوں میں یہ فاصلہ طے کررہی ہیں اور پہلے سے بھی بدتر حالت میں مسافروں کے ساتھ آرام اور کھانوں کا معیار پست سے پست ہو چکا ہے۔

ذرا ملاحظہ کریں کہ ہم آگے بڑھنے کے بجائے اسی طرح ہڑتال، توڑ پھوڑ، گھیراؤ اور جلاؤ کر کے کس کو فائدہ پہنچا رہے ہیں، کس کی املاک اور بسوں کو جلا کر نقصان پہنچا رہے ہیں کیا یہ ہمارے ہی کسی بھائی کی املاک اور بس یا گاڑی نہیں ہے۔ اگر ہم اس مہنگائی اور معیشت کی تنزلی کو محسوس کر لیتے تو کیا ہم کسی کی بس جلاتے، اپنے ہی بھائی کا دن دہاڑے قتل کرتے۔ کیا ہمارے سارے دشمن ختم ہو گئے ہیں جو اپنے ہی بھائی کے قتل کے در پہ ہیں۔ کیا ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان کے لئے حلال ہو گیا ہے۔ ایک تنظیم کے مسلمان جو ایک خدا اور ایک رسول ہی کے نام پر مساجد میں جمع ہو کر نمازیں پڑھتے ہیں، دوسری تنظیم کے مسلمانوں کو قتل کر کے سکون اور نجات پا سکتے ہیں۔ کون ہیں جو ہم کو ورغلا رہے ہیں، ایک دوسرے سے لڑوا رہے ہیں۔ کیا آئے دن کی ہڑتال توڑ پھوڑ اور قتل و غارت سے اپنے ہی ملک کی معیشت کو کھوکھلا نہیں کر رہے ہیں کیا ایسی حرکتیں ترقی یافتہ ممالک یورپ، امریکا اور آسٹریلیا میں ہوتی ہیں، آپ کہیں گے نہیں تو ہم کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ وہ دن رات عوام کی بھلائی اور اپنی اپنی حکومتوں کو مضبوط کرنے کے لئے لگے ہوئے ہیں ان کی کرنسیاں ہم جیسے بے وقوف اور پسماندہ ممالک کے مقابلہ میں کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہیں۔ ہم کو لڑا کر اندرونی اور بیرونی دونوں طریقے سے وہ اپنا مفاد حاصل کر رہے ہیں بھارت اور پاکستان دونوں کو لڑوا کر ہی وہ 140 کروڑ انسانوں کی منڈی حاصل کرنا ان کا سب سے بڑا ٹارگٹ ہے جو گزشتہ 52 سال سے وہ ہم کو لڑوا کر حاصل کر رہے ہیں اور ہم نادان جذباتی بے وقوفوں کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر لڑ رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ کس کا اسلحہ بک رہا ہے، کون اپنے عوام کی غربت، جہالت اور آسودگی ختم کر کے اسلحہ کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ سو ڈیڑھ سو سال پہلے یہ ہی ممالک ہماری طرح ایک دوسرے سے جنگ کرتے تھے۔ تعلیم سے دور تھے آج انہوں نے تعلیم حاصل کر لی، عقل آ گئی، تو آج وہی کام ہم سے کروا رہے ہیں۔ بھوک اور افلاس سے مرنے والوں کا انہیں کوئی احساس نہیں ہے۔ تعلیم سے ہمارے بچے دور رہیں، دو وقت کی روٹی رہنے کو کوئی سایہ، ان کا مقصد نہیں ہے۔

ہاں اگر ہم دونوں مل جائیں ایک دوسرے کے دشمنوں کو سمجھ لیں تو خود ان کی تاریخ دہرائی جائے گی۔ وہ کیوں ہمیں ایک ہونے دیں گے۔ جنرل صاحب آپ کو قدرت نے شاید یہ موقع فراہم کیا ہے کہ خط خود

انہوں نے ہی لکھا، دعوت انہوں نے ہی دی ہے اور آپ نے بھی مثبت جواب دیا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ اگر آپ نے حل کروالیا تو تاریخ میں آپ امر ہو جائیں گے۔ اگرچہ بھارتی اپنے قول و فعل میں ایک نہیں ہیں مگر حالات بھی اب ان کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ ان کے لئے بھی اب سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن چکا ہے۔ تمام فریقوں کے لئے یہی سنہری موقع ہے کہ اس کو حل کر ہی لیں اس میں سب ہی کی بھلائی ہے۔ اس خطہ کا امن تینوں فریقین کا مرہون منت ہے۔ 114 کروڑ عوام کا مستقبل بھی سدھر جائے گا۔ خدا کے لئے اب تو سوچیں بھلا بھوکا بھی بھوکے کا دشمن ہو سکتا ہے۔

08th June, 2001

سانپ کے منہ میں چھچھوندر

اس سال عید میلا دالنبی ﷺ کے موقع پر جنرل پرویز مشرف صاحب نے بلاشبہ بڑے ہی مثبت انداز میں علمائے کرام سے خطاب کیا اور ملک میں مذہبی جذبات ابھارنے کے عمل کو منفی اثرات سے روکنے کے لئے آگے آنے کی تلقین کی، ان کی یہ مثال کہ پہلے شیعہ سنی فسادات ہوتے تھے ایک دوسرے کی جان کے درپے ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی پراپرٹی غیر محفوظ ہوتی تھیں۔ مگر آج اہل سنت اور اہل دیوبند بھی اس میں شامل ہو کر ایک دوسرے کو قتل کر کے بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں، جبکہ اسلام نے تو ایک مسلمان کی جان و مال کو دوسرے مسلمان کے لئے مکمل حرام قرار دیا ہے اور اس مسلمان قاتل پر تمام بقایا زندگی کے لئے جنت کو حرام قرار دیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو قتل کرنے سے باز نہیں آ رہے ہیں، پہلے مساجد سب سے زیادہ محفوظ جگہیں تصور کی جاتی تھیں مگر آج کھلے عام مساجد اور امام بارگاہیں خون سے نہا رہی ہیں ہر مسجد کے باہر باقاعدہ پولیس کا پہرہ اب ضروری ہو چکا ہے۔ عیدین اور جمعۃ المبارک کی نمازوں میں مساجد کے باہر باقاعدہ موبائیلیں ان نمازیوں کی حفاظت کے لئے کھڑی کی جاتی ہیں۔ آخر ہم کب تک اس غیر اسلامی، غیر قانونی، غیر اخلاقی حرکتوں سے اجتناب نہ کریں گے اور کب تک ہمارے مظلوم نہتے عوام ان کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہیں گے۔ کب تک ہماری مظلوم عورتیں، بیوائیں اور ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث ہوتے رہیں گے۔ اب یہ ہمارے علمائے کرام کا فرض ہے کہ آگے بڑھیں اور ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کریں ایک دوسرے کے عقائد سے ٹکراؤ کی پالیسیوں سے دور رہیں اور ایک دوسرے کی مساجد کو اللہ کا گھر سمجھتے ہوئے ان کا احترام کریں۔ تب جا کر ہم سنت نبوی ﷺ کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور عید میلا دالنبی ﷺ کی محبت کے دعویدار ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ موجودہ حکومت کسی طرح اسلحہ کی سیاست کو اس

ملک سے پاک کر دے تا کہ ہم اس دردناک صورتحال سے ہمیشہ ہمیشہ نجات حاصل کر لیں۔ اس طرح ہماری اقتصادی صورتحال بھی بہتر ہو جائے گی اور دنیا والوں کی نگاہوں میں بھی ہم دہشت گرد کہلانے سے بچ جائیں گے۔

دوسری ضروری اور اہم خبر دورۂ بھارت ہے جس پر تمام دنیا کی نظریں لگی ہیں۔ یہ دوسرا موقع ہے جب موجودہ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی صاحب نے پاکستانی حکمرانوں کو مذاکرات کی دعوت دی ہے اور اس میں مسئلہ کشمیر پر بھی بات چیت کی پیشکش کی ہے۔ جس دن ان کا بیان اخبارات میں چھپا ٹھیک تیسرے دن سے ان کے وزراء کھلم کھلا کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دینے لگے اور کشمیر کو بھارت سے جدا نہیں ہونے کا دعویٰ بھی کرنے لگے۔ اگر واقعی کشمیر کو عملی طور پر بھارت کا حصہ بنانا چاہتے تو اب تک وہ رائے شماری کروا سکتے تھے۔ مگر ان کو معلوم ہے کہ رائے شماری ہونے کی صورت میں کشمیری عوام کسی بھی طرح بھارت کی غلامی میں نہیں رہ سکتے اور گزشتہ پچاس سال سے مظالم، قتل و غارت گری، عورتوں کی عصمت دری اور نوجوانوں اور بچوں کا قتل عام بھلانے سے بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ میں حیران ہوتا ہوں ایک طرف ان کا وزیراعظم کشمیر سمیت تمام تنازعات پر بات چیت کی دعوت دیتا ہے تو دوسری طرف ان کے وزراء، دانشور، اخبارات، ٹی وی ذرائع ابلاغ کشمیر کو پاکستان سے دور رہنے اور بھارت کے ساتھ دیگر صوبوں کی طرح رہنے کی توجیہات پیش کرنے لگتے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے صاف الفاظ میں پہلے بھی کہا تھا کہ ہمارے تنازعات نہیں ہیں صرف ایک تنازعہ ہے وہ ہے مسئلہ کشمیر، لہٰذا جب کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا تو خود بخود بقایا چھوٹے چھوٹے مسائل حل ہو جائیں گے اور اس خطے میں امن بھی اسی صورت میں قائم ہو سکے گا۔ میری ناقص رائے میں جہاں ہمارے دیگر دانشور بھی متفق ہیں کہ بھارتی وزیراعظم پہلے کے وزیراعظموں کی طرح بلا کر ایک نئی لالی پاپ دیکر کچھ عرصہ کے لئے جنگ بندی اور کشمیری عوام کے لئے دباؤ بڑھانے کا موقع لینا چاہتے ہیں اور ساتھ ساتھ وہ ہم کو چین جیسے مخلص دوست سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ ٹی وی اور دیگر اخبارات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کا دوست امریکا گنواتے ہیں اور بھارت سے دوستی بھی ضروری قرار دیتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اصلی دوست برے وقت میں ہی پہچانا جاتا ہے بھارت صرف اور صرف بیرونی دباؤ کی وجہ سے مسئلہ کشمیر کی بات کرتا ہے اور اب خود اس کے عوام کا دباؤ بھی بڑھ رہا ہے وہ خود اس خونریزی سے تنگ آ چکے ہیں۔ ان

کی کاروباری ایسوسی ایشن، فیڈریشن، چیمبر آف کامرس کے عہدیداران اور صنعتکار سمیت تمام ادارے متفقہ طور پر کئی بار حکومت پر دباؤ ڈال چکے ہیں کہ بھارت اور پاکستان میں کھلی تجارت ہونی چاہئے۔ نیپال کی طرح آنے اور جانے کے ویزے سے پابندی اٹھالینی چاہئے، خود یورپی ممالک ویزوں کے جھمیلوں سے دور ہو چکے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے پڑوسی ہونے کے ناتے ایک دوسرے کے ملک میں سفر کے لئے اتنی مشکلات کیوں اٹھائیں۔ یورپ اور امریکا کی مہنگی اشیاء کیوں درآمد کریں کیوں نہ ہم ایک دوسرے کی تجارت سے عوام کو فائدہ پہنچائیں۔ یہاں میں پرویز مشرف صاحب کے اس نعرے کو بہت اہمیت دوں گا جو انہوں نے کہا کہ ہم کو لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے والے جیسے احمقانہ نعروں سے بھی اجتناب کرنا چاہئے۔ اگر بھارتیوں نے بھی یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا کہ ہم کراچی میں مزار قائد پر بھارتی ترنگا جھنڈا لہرا دیں گے تو کیا آپ برداشت کریں گے۔ اب وہ زمانہ گیا جب ایک ملک دوسرے ملک پر حکمرانی کی طاقت رکھنے کے باوجود عملاً نہیں کر سکتا اگر ایسا ہوتا تو افغانستان جیسا چھوٹا ملک دنیا کی سب سے بڑی طاقت روس کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا اور روس کو شکست فاش ہو جاتی ہے۔ اور خود روس ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر بھارت اپنی طاقت کے زعم میں پاکستان کو اپنی مملکت بنانا چاہتا ہے تو وہ اس کی بھول ہے۔ مسلمان ویسے بھی غلامی کی زندگی سے موت کو بہتر سمجھتے ہیں۔ بھارت کی کیا مجبوریاں ہیں جو وہ پاکستان کو دعوت دے رہا ہے یہ تو وقت آنے پر ہی پتہ لگے گا جب بات چیت کا دور شروع ہوگا تب اس کے پتے کھلیں گے۔ اگر مسلمانوں کی آزادی کی تاریخ دیکھی جائے اور خود نزدیک ترین تاریخ افغانستان کی ہے جب وہ روس سے جنگ کر رہا تھا یعنی عالم کفر کے مقابلے میں تمام علماء تمام عوام ایک تھے مگر جیسے ہی جنگ ختم ہوئی روسی فوجیں واپس گئیں تو تمام علماء ایک دوسرے سے الگ ہو کر برسر پیکار ہو گئے اور افغانستان کئی حصوں میں بٹ گیا کہیں کسی کی حکومت تھی تو کسی حصہ پر دوسرے کا قبضہ تھا، اب ایک دوسرے سے کھلم کھلا اعلان جنگ ہوتا گیا حکومتیں بنتی گئیں ٹوٹتی گئیں، اتحاد بنتے گئے ٹوٹتے گئے آج بھی ایک مخصوص حصہ پر جنگ جاری ہے اگرچہ بڑا حصہ طالبان کے قبضے میں ہے مگر پھر بھی دونوں طرف سے لوگ مر رہے ہیں۔ اسلحہ کا بے دریغ استعمال ہو رہا ہے روس اور افغانستان جنگ میں اتنے لوگ شہید نہیں ہوئے تھے جتنے آزادی کے بعد آپس کی جنگ میں مسلمان شہید ہو رہے ہیں۔ ہم اس کو کیا نام دیں گے کیونکہ مرنے اور مارنے والے دونوں ہی مسلمان ہیں اگر اسی طرح کشمیر کا حل بھی ہندوستان اور پاکستان

دونوں ملکر طے کر کے کشمیر خود ان کے موجودہ علماء کے حوالے کر دیا تو اس بات کی کون گارنٹی دے گا کہ یہی علماء اور بڑی بڑی جماعتیں اقتدار حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو جائیں گے اور پھر افغانستان کی طرح ایک سلسلہ جنگ شروع ہو جائے گی کچھ جماعتیں ایک طرف ہوں اور کچھ جماعتیں دوسری طرف ہو کر اقتدار کی جنگ شروع کر دیں بے چارے مظلوم عوام دوبارہ پس جائیں گے۔ ہمارے کشمیر میں تو پہلے ہی دو بڑے دھڑے ہیں ایک دھڑا آزاد کشمیر کہلاتا ہے جو حکومت پاکستان کے زیر اثر ہے تو دوسرا دھڑا جموں و کشمیر کہلاتا ہے جس میں بھی دو کشمیری دھڑے نمایاں ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف بھی، ایک دھڑا بھارتی حکومت کا ایجنٹ فاروق عبداللہ کا ہے جو شروع ہی سے برسر اقتدار رہا ہے اور آج بھی ہے۔ دوسرا دھڑا اس میں کئی چھوٹی بڑی سیاسی مذہبی جماعتیں شامل ہیں وہ ہمیشہ الیکشن کا بائیکاٹ کرتی رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے فاروق عبداللہ باآسانی الیکشن لڑ کر یکطرفہ حکومت بناتے رہے ہیں جس کی سرپرستی بھارتی حکومت کرتی رہی ہیں اور المیہ تو یہ ہے کہ مرکز میں کوئی بھی حکومت آئے یا جائے آپس میں تو وہ دست و گریباں رہتے ہیں، اسمبلیوں میں ایک دوسرے پر کرسیاں تک اٹھانے سے باز نہیں آتے مگر کشمیر کے معاملے میں سب ایک ہوتے ہیں اور اسی فاروق عبداللہ کی حکومت کی سرپرستی کرتے ہیں جب کشمیری عوام کا دباؤ سڑکوں پر بڑھ جاتا ہے تو خود ہی فاروق عبداللہ کی حکومت برطرف کر کے گورنر راج نافذ کر دیتے ہیں اور جب معاملہ چند سال میں ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو دوبارہ فاروق عبداللہ کو لانے کے لئے نام نہاد الیکشن کا ڈھونگ رچا کر دوبارہ اس کو مسلط کر دیتے ہیں۔ جنرل مشرف صاحب کو اس مسئلہ کو حل کرتے وقت مندرجہ بالا صورتحال کے علاوہ یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ 1947ء کی طرح اعلان آزادی کے ساتھ ساتھ کشمیر کے علاوہ خود ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے دوبارہ نسلی فسادات نہ پھوٹ پڑیں اور مسلمانوں کو دوبارہ قتل عام، عصمت دری، اپنے اپنے مال اور جائیداد کا تحفظ کون فراہم کرے گا۔ یہ خدشات نہیں ہیں بلکہ یہ ہمارا ماضی ان واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ بھارتیوں نے مسئلہ کشمیر کو پچاس سال میں سانپ کے منہ میں چھچوندر بنا کر رکھا ہوا ہے۔ کوئی معجزہ ہی اس کو حل کروا سکتا ہے۔

14th June, 2001

نئے عمرہ پیکج کے لئے چند تجاویز

حرمین شریفین یعنی مکہ معظّمہ میں خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ﷺ کی توسیع اور تزئین کا تاریخ میں جب ذکر آئے گا تو خادم حرمین موجودہ حکمران شاہ فہد بن عبدالعزیز کا نام سرفہرست ہوگا جنہوں نے اپنے حکمرانی کے روز اول سے لیکر آج تک جتنی توسیع اور تزئین کی ہے کسی ایک فرد واحد کی حکمرانی میں نہیں ہوسکی تھی جوانہوں نے اپنے عہد میں کی جس کا اجرً یقینا اللہ کے دربار سے ملے گا۔ 1973ء میں جب میں نے پہلا حج کیا تھا تو خانہ کعبہ کے اردگرد کچا فرش تھا جس پر باریک بجری پڑی ہوتی تھی اندازہ لگائیے کہ گرمی میں گرم فرش پر طواف میں کتنی تکالیف ہوتی ہونگی، ایئر کنڈیشن نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور کوئی پکا فرش بھی نہیں تھا اور سب کچھ کھلے آسمان تلے طواف ہوتا تھا۔ صرف گراؤنڈ فلور تھا۔ اسی طرح مسجد نبوی ﷺ بھی غیر ایئر کنڈیشنڈ تھی اس کا صحن بھی کچا تھا اس پر بھی باریک سی بجری ہوتی تھی، مسجد کے پرانے گنبدوں سے آج بھی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پہلے کتنی گنجائش تھی اور اب اس میں کتنی زبردست توسیع کی گئی ہے اور انتہائی مہارت سے دنیا بھر سے خوبصورت ترین آرائش کے ساتھ ساتھ حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لئے دنیا کے سب سے بڑے ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں ان فرائض کو ادا کرنے میں کتنی آسانیاں پیدا کی گئی ہیں جس کی وجہ سے پوری دنیا سے مسلمانوں کی تعداد اب 25 لاکھ سالانہ ہوچکی ہے اس کے لئے ہم موجودہ حکمرانوں، انتظامیہ اور سرکاری اہلکاروں کو خراج تحسین پیش نہ کریں تو یہ ہمارا بخل ہوگا۔

اتنے بڑے اجتماعات کو ہر سال تین مرتبہ شعبان، رمضان اور حج کے موقع پر سنبھالنا بھی اللہ کا بڑا کرم ہے۔ غیر مسلم اور بالخصوص یورپی ممالک آج تک حیران ہیں کہ مسلمانوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے گھروں کی زیارت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے پوری دنیا کے کونے کونے سے مسلمان کیوں اکٹھے

سوتے ہیں اور عبادات کی ادائیگیاں کرنے کے بعد اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ جاتے ہیں اور یہ تمام مراحل بڑے امن وسکون سے انجام پاتے ہیں اور کوئی ہنگامہ آرائی تک نہیں ہوتی۔

سعودی انتظامیہ مسلمانوں کے آرام کے لئے نئی نئی اور جدید پالیسیاں بناتی رہتی ہے جس میں بسوں کا سفر آرام دہ ہو، رہائش میں کوئی مسئلہ نہ ہو، کھانے پینے کی اشیاء وافر ہوں اور مناسب قیمتوں میں دستیاب ہوں۔ جن لوگوں نے آج سے پچیس سال پہلے حج یا عمرہ کیا ہوگا تو انہیں یہ یاد ہوگا کہ جدہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ منورہ تک ایک ہی سڑک ہوتی تھی جو آج بھی مین شاہراہوں سے دور چھوٹے چھوٹے گاؤں سے گزرتی ہے۔ جن پر دو بسیں ہی گزر سکتی تھیں، جبکہ آج چار چار لین کی یکطرفہ شاہراہیں ان کی جگہ لے چکی ہیں۔ پرانی اور غیر ایئر کنڈیشنڈ بسوں کی جگہ اب جدید کوچیں آچکی ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سعودی حکومت آج بھی حاجیوں اور زائرین کے لئے زیادہ سے زیادہ آرام فراہم کرنے میں مصروف ہے۔ حج اور عمرہ کے رش کے دنوں میں بھی کھانے پینے کی کبھی بھی قلت نہیں ہوتی۔ حاجیوں کے لئے جدید ایئر کنڈیشنز، حاجی کیمپ اور ایئر پورٹ الگ بنایا ہوا ہے۔ جہاں ساری دنیا سے جہاز اترنے کے جدید انتظامات ہیں۔

مگر اس سال عمرہ کے زائرین کی جو سعودی حکومت نے پالیسی بنائی ہے اس سے بظاہر کئی مشکلات پیش آنے کے فوری امکانات ہیں۔ آج تک ایسی سخت پالیسی دیکھنے میں نہیں آئی، اس پالیسی سے زائرین کو نہ صرف تکالیف ہونگی بلکہ ایک معقول تعداد بھی عمرہ کی ادائیگی سے محروم ہوجائے گی۔ پہلے تو ہر مسلمان جب چاہتا تھا عمرہ کے لئے چلا جاتا تھا، اپنی مرضی سے آنا جانا، ٹھہرنا، کھانا پینا سب خود اس کے بس میں تھا۔ مگر اب اس کو روز اول سے عمرہ پیکج کے لئے صرف ان ٹریول ایجنٹس کے پاس جانا پڑے گا جو سعودی عمرہ پیکج دینے کے اہل ہونگے۔ سعودی حکومت نے سعودی عرب میں تقریباً 200 عمرہ کے لائسنس دیئے ہیں جو پوری دنیا میں اپنے ایجنٹ بنائیں گے اور ان کے ہر ایجنٹ کو ایک لاکھ ریال نقد یا بینک گارنٹی دینی ہوگی۔ یہ ایجنٹ مختلف عمرہ پیکج دیں گے۔ صرف ویزہ کمیشن 150 ریال یعنی تقریباً تین ہزار روپے تو اضافی دینے ہی ہونگے۔ اس کے علاوہ ایجنٹس جدہ سے مکہ اور مدینہ کے آنے جانے کا بس کا کرایہ، رہائش کی رقم پیشگی وصول کرے گا۔ سب سے زیادہ مشکل ترین مرحلہ تو حصول ویزہ میں پیش آئے گا جو پہلے مقامی سعودی قونصلیٹ سے ویزہ ملتا تھا اب ویزے کی درخواست سعودی عرب میں اس لائسنس یافتہ کمپنی کو بھیجی جائے گی۔ وہ ویزہ کے کاغذات سعودی

عرب میں ویزہ حکام کو دیں گے، ویزہ کے مجاز حکام اور تمام ضروری دستاویزات دیکھ کر سعودی ایمبیسی کو اطلاع دیں گے تب جا کر ویزہ جاری ہوگا اور اس میں جو مدت بتائی گئی ہے وہ کم سے کم 15 روز کی ہوگی۔ اگر کوئی دستاویز کم وبیش ہونگی تو اس میں مزید وقت لگے گا۔ جو انتہائی تکلیف دہ مرحلہ ہو جائے گا۔ خاص طور پر جب شعبان اور رمضان میں تمام دنیا کے مسلمان عمرہ کی ادائیگی کے لئے یہاں آئیں گے تو پہلے حصول ویزہ کا انتظار اور پھر جہازوں کی سیٹوں کا معاملہ بہت دشوار طلب ہوگا اور ہر عمرہ کرنے والے کو تین ہزار روپے اضافی دینے کے باوجود بھی عمرہ پیکج اس کی پریشانیوں میں اضافہ کرے گا۔ اور اس کا ٹریول ایجنٹ اس کا پاسپورٹ لیکر بیٹھ جائے گا اور پھر ''دھندہ'' شروع ہو جائے گا۔ پہلے تو یورپ اور امریکا کے ویزے رکھنے والے ایک دن میں ایمبیسی سے ویزہ لے لیتے تھے اب وہ بھی عمرہ پیکج کی زد میں آ گئے ہیں۔ یعنی یورپ اور امریکا تو وہ خود جا سکتے ہیں مگر اللہ کے گھر جانے کے لئے وہ اپنے پاسپورٹ ان ایجنٹوں کو کیسے حوالے کریں گے جن پر اتنے قیمتی ملٹی پل (Multiple) ویزے لگے ہونگے۔ ان ایجنٹوں کا کوئی بھی ملازم ایسے پاسپورٹ پر کام دکھا سکتا ہے۔ اسی طرح یورپ اور امریکا جانے والے اپنے پاسپورٹ کا رسک ہرگز نہیں لیں گے اور ہزاروں افراد عمرہ کی سعادت سے محروم ہو جائیں گے۔

آخری اطلاعات کے مطابق سعودی حکام نے ایران سے عمرہ پیکج پالیسی سے انکار کرنے پر اس سال ایران کو مستثنیٰ کر دیا ہے جبکہ بھارت، بنگلہ دیش اور یورپی ممالک کے مسلمانوں نے اس پالیسی کو اپنانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پالیسی سے کم از کم تین ہفتوں تک کوئی بھی عمرہ کے لئے نہیں جا سکے گا۔ اس سے خود سعودی عرب کی معیشت پر کاری ضرب لگے گی جب لوگ ان ضابطوں (Formalities) کی کارروائی میں گھر جائیں گے تو ہوٹل انڈسٹری، کھانے پینے کے اسٹورز، ٹرانسپورٹرز، دوکاندار جب متاثر ہونگے تو لامحالہ فیکٹریاں بند ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوگا اور جو عمرہ سے محروم ہوگا وہ یقیناً دل میں سعودی حکام کو برا بھلا بھی کہے گا۔ خود اللہ کا گھر اور حضور ﷺ کی مسجد نبوی ﷺ خالی خالی نظر آئے گی۔ کہیں یہ اللہ کے غیض وغضب کو دعوت نہ دے۔

میری سعودی وزارت حج وعمرہ سے بالعموم اور محترم شاہ فہد بن عبدالعزیز صاحب سے بالخصوص درخواست ہے کہ وہ اس عمرہ پالیسی کو فوری طور پر مؤخر کر دیں اور پرانے طریقہ کار کو بحال کر دیں اور پھر اس پالیسی کا بھرپور جائزہ لیں، پوری دنیا سے ماہرین، ٹریول ایجنٹس، ہوٹل ایسوسی ایشن کے عہدیداران سے

مشورہ کریں چند ہزار غیر قانونی رک جانے والوں کا تدارک لاکھوں زائرین سے نہ کریں، پوری دنیا تو سیاحوں کی طلب میں بڑے بڑے شاندار منصوبے اور ہوٹل پیکج پیش کرتی ہے کجا یہ کہ زائرین کے آنے اور جانے میں رکاوٹ ڈالنا خود سعودی معیشت کے ساتھ سنگین مذاق ہے جو چند مہینوں کے بعد ہی نظر آنے لگے گا۔ مجھے امید ہے کہ وزارت حج وعمرہ ان تجاویز کو سنجیدگی سے غور کر کے ان مشکلات کو ختم کرنے کے احکامات جاری کرے گی۔

22nd June, 2001

س۔ش۔عزیز

ہمارے وزیرخزانہ شوکت عزیز صاحب گزشتہ کئی ماہ سے مختلف پلیٹ فارمز سے خوشخبری سناتے رہے کہ اس مرتبہ بجٹ بہت مراعات دے گا اور کوئی نیا اضافی ٹیکس نہیں لگے گا۔ تاجروں اور صنعت کاروں نے ان کے وعدوں پر بڑی امیدیں وابستہ کرلیں اور وہ خوش بخت بجٹ کا انتظار کرنے لگے۔ اللہ اللہ کر کے 18 جون کو بجٹ پیش کر دیا گیا۔ جوں جوں ہمارے وزیرخزانہ شوکت عزیز صاحب کی تقریر آگے بڑھتی جاتی، تاجروں، عوام اور صنعت کاروں کی مایوسی بھی بڑھتی جاتی۔ سب سے بڑا دھچکا تو بجٹ آنے سے ایک ہفتے پہلے ہی پیٹرول اور ڈیزل مٹی کا تیل اوسطاً 10 فیصد مہنگا کر دیا گیا۔ گویا اب ہم امریکا اور یورپ والے داموں میں پاکستان میں پیٹرول خریدیں گے۔ گویا ہم نے یورپ اور امریکا کے برابر ترقی کرلی اور وہی ماضی کے وزیر خزانہ سرتاج عزیز صاحب کی طرح موجودہ وزیرخزانہ شوکت عزیز صاحب نے بھی اس بجٹ کو پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ اس سے عام آدمی پر اثر نہیں پڑے گا۔ جبکہ پیٹرول، ڈیزل، مٹی کا تیل، بجلی گیس کے نرخوں میں اضافہ ہونے کے باوجود یہ کیسے ممکن ہے کہ عام آدمی اس سے متاثر نہیں ہوگا۔ گویا یہ تمام اشیاء عام آدمی استعمال نہیں کرتے۔ غالباً جن اور فرشتے استعمال کرتے ہیں۔ اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ تمام کھانے پینے مثلاً آلو، پیاز، ٹماٹر تک کی درآمد پر 5 فیصد ڈیوٹی لگا دی گئی۔ ان کا یہ دعویٰ بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم نے گیس اور بجلی کے بڑے صارفین کے لئے اضافی قیمتیں مقرر کی ہیں۔ جناب جب بڑے صارفین یعنی بڑی بڑی صنعتوں کو بجلی کے اضافی نرخ ادا کرنے پڑیں گے تو وہ اس فیکٹری میں بننے والی ہر شے پر بوجھ ڈال دیں گے۔ تو خود بخود وہ اشیاء مہنگی ہو جائیں گی۔ کوئی بھی صنعت کار مہنگی بجلی خرید کر سستی چیزیں نہیں بنا سکتا وہ تو عام آدمی پر ڈال دے گا تو کیسے عام آدمی متاثر نہیں ہوگا۔

یہ بات اور بھی انوکھی لگتی ہے کہ ہمارے وزیرخزانہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ احتساب، ٹیکس سروے، رجسٹریشن وغیرہ وغیرہ کے اقدامات سے ہماری معیشت کو بڑھا دھچکا لگا ہے اور بیرون ملک سرمایہ منتقل ہو رہا ہے اور غیرملکی سرمایہ کاری میں رکاوٹ پڑی ہے اگر ایسا ہے تو پھر ہم کو عملی طور پر اعتراف کرنے کے بعد ان اقدامات کو واپس کیوں نہیں لیا جاتا۔ آخر اس میں کیا رکاوٹیں ہیں جو وہ دور نہیں کر سکتے اسی طرح سیلز ٹیکس جو غیر ڈاکومینٹری تھا۔ ڈیڑھ فیصد سے بڑھ کر تین فیصد کر دیا گیا اور درآمدی اشیاء پر 15 فیصد سے بڑھا کر 20 فیصد کر دیا گیا ہے کہ یہ اضافہ کیا عام آدمی پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ تمام درآمد کنندگان یہ بوجھ بھی عوام پر ہی ڈال دیں گے۔ بجٹ میں معطل سینیٹ اور اسمبلیوں کے لئے ایک ارب اور 24 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جبکہ ہمارے موجودہ صدر جناب پرویز مشرف صاحب نے فرمایا کہ الیکشن شیڈول کے مطابق اکتوبر 2002ء تک ہو جائے گا تو یہ ایک ارب 24 کروڑ کے اخراجات کا بوجھ کیوں عوام پر قبل از وقت ڈال دیا گیا ہے۔ تقریباً تمام اشیاء کی درآمدات بشمول مشینری پلانٹ ان کے پرزوں پر 20 فیصد اور 25 فیصد سے 30 فیصد کر دیا گیا ہے۔

سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں 50 فیصد تک اضافہ کر دیا گیا ہے جو حقیقی طور پر 18 فیصد تک بنتا ہے، ایک طرف ہم گولڈن شیک ہینڈ، ڈاؤن سائزنگ، برطرفی جبری رخصت کر رہے ہیں اور دوسری طرف ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر کے ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اضافہ کرنے کے بجائے اگر 18 فیصد ڈاؤن سائزنگ کے لئے مختص کر کے 18 فیصد بے روزگاری روکی جا سکتی تھی۔ یہ اقدام کر لیا جاتا تو دوہرے نتائج ہو سکتے تھے۔ کم از کم 18 فیصد ملازمین اسی تنخواہوں پر رکھے جا سکتے تھے اور اس دوران نج کاری کی طرف تیزی سے عمل کر کے بڑے بڑے ادارے جو مسلسل نقصان دے رہے ہیں نج کاری کے ذریعے فروخت کر کے آنے والے سالوں میں ہم مزید خسارہ روک سکتے تھے تو کیوں نہ اس عمل میں غیر معمولی تیزی کر کے ہم ان دیمکوں والے اداروں سے نجات حاصل کر لیتے اور ہمارے صنعت کار ان اداروں کو جلدی دوبارہ منافع بخش بنا کر مزید بے روزگاری کو روک سکتے ہیں۔

اس میں بھی فوری پیش رفت کی ضرورت ہے۔

ایک طرف ہم اپنے آپ کو غریب ملک کہتے ہیں تو دوسری طرف ہم نے چیف ایگزیکٹو کے سالانہ

اخراجات کے لئے ساڑھے چار کروڑ روپے رکھے ہیں۔صدر، وزراء، مشیران کے لئے بھی کروڑوں روپے کا بجٹ رکھا ہے، کیا ہم سادگی کی زندگی نہیں گزار سکتے جب تک ہمارے قرضے کم ہو جائیں ہم مزید قرض لینے سے کیوں گریز نہیں کرتے۔

بجٹ میں بے شک کچھ مثبت اقدامات کا اعلان کیا گیا ہے جس میں خصوصی طور پر بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں سے بھیجی جانے والی رقوم کو شیڈول بینک کے ذریعے بھیجنے پر مراعات دی گئی ہیں۔میرے خیال میں اگر ہم ہنڈی کے کاروبار کو روکنا چاہتے ہیں تو بھیجنے والے پاکستانی کو مارکیٹ ریٹ پر ڈالر اور دوسری کرنسیوں کو آفیشل طریقہ سے کیش کرانے کا طریقہ کار وضع کیا جانا چاہئے۔ہنڈی کے ذریعے ڈالر مارکیٹ کی قیمت پر فروخت ہوتا ہے جس کی وجہ سے عام طور پر تین اور چار روپے کا فرق ہمیشہ رہتا ہے لہٰذا وہ نقصان دینے کے بجائے شیڈول بینک کو اجازت دی جائے۔وہ ہر بھیجنے والے کی رقم مارکیٹ پرائس پر ادا کرے۔اس سے سو فیصد ہنڈی اور غیر قانونی کاروبار ختم ہو جائے گا۔اور بھیجنے والا پاکستانی بھی سکون سے اپنی رقم بھیج سکے گا۔ اور جب تک تین اور چار روپے کا فرق رہے گا۔عام آدمی ہنڈی کو ترجیح دے گا۔

بجٹ میں پہلی مرتبہ پنجاب کی کوآپریٹیو بینک اور فنانس کمپنیوں میں ڈوبی ہوئی رقم کے متاثرین کے لئے نیب کو اجازت دی ہے کہ وہ ان دھوکہ باز اداروں سے یہ رقم وصول کر کے عوام کو لوٹائے۔یہ بہت اچھا قدم ہے اور اس سے حکومت کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا۔مگر یہ عمل صرف پنجاب تک ہی کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ سندھ کے عوام سے ہونے والے ظلم کے بھی ازالہ کے لئے اقدامات ضروری ہیں۔یہاں بھی بہت سے فنانس کمپنیوں کے مالکان 5 ارب روپے کراچی اور اندرون سندھ کے غریب معصوم عوام بشمول بیوگان، بوڑھے پنشنرز سے کھا کر آرام سے بیٹھے ہیں۔ان سے بھی یہ رقوم وصول کر کے ان متاثرین کو دلوائے جائیں۔آخر اس صوبے کا کیا قصور ہے۔اس کو نظر انداز کر کے پھر احساس محرومی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ سندھ میں بھی نیب کو اختیار دیں کہ وہ اپنی کارروائی کر کے ان اداروں کے مالکان کو گرفتار کرے اور ان سے یہ رقوم وصول کر کے ان کی دعائیں لیں۔اور یکساں اصول وسلوک برقرار رکھیں۔

بجلی کے بحران کو دور کرنے کے لئے علاوہ واپڈا کی نجکاری کے لئے کم از کم ملک میں جنریٹر کی درآمد پر تمام ڈیوٹیاں ختم کروائی جائیں جبکہ ان کی درآمدات کیلئے خصوصی قرضے فراہم کرے تاکہ لوڈ شیڈنگ سے

نجات ملے اور ان کی بلاضرورت NOC اور دوسری سرکاری رکاوٹیں دور کی جائیں۔ان پر صوبائی ٹیکس بھی معاف کر دیا جانا چاہئے۔خاص طور پر گیس سے چلنے والے جنریٹر کی درآمدات پر توجہ دینی چاہئے۔ان اقدامات سے ہمارے اخراجات میں زبردست کمی ہوگی اور اشیاء کے نرخ کم ہو سکیں گے۔ہمارے وزیر خزانہ کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ان کی توجہ عوام کے مسائل کو کم کرنے کے میں مددگار ثابت ہوگی اور روایتی بجٹ پیش کرنے کے بعد ہم ان اقدامات سے کچھ آنسو پوچھ سکیں گے۔

06th July, 2001

آخری نماز

جب سے امریکا کے نئے صدر جارج بش نے اقتدار سنبھالا ہے امریکن اکانومی زوال کی طرف جارہی ہے۔ ہمارے ملک کی طرح امریکیوں کی قوت خرید دن بدن کم ہورہی ہے۔ سابق صدر کلنٹن کے دور میں امریکی اکانومی نے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ بیروزگاری ختم ہوگئی تھی۔ بلکہ خصوصی طور پر باہر سے لیبر (مزدور) منگوائے جارہے تھے قریبی ملکوں سے تین سے چھ ماہ کے ویزا پرمٹ ایشو کر کے غیر ملکیوں کو نوکری (job) فراہم کررہے تھے۔ عوام صدر کلنٹن سے بہت خوش تھے۔ مگر جب الیکشن ہوئے تو صرف ایک ریاست کے ووٹ کی وجہ سے ان کی پارٹی ہارگئی اور مخالف پارٹی کے امیدوار جارج بش صدر کے عہدہ پر فائز ہوگئے۔ اگرچہ انہوں نے نئی نئی اصلاحات کی ہیں مگر جلد ہی وہ غیر مقبول ہوتے جارہے ہیں۔ بیروزگاری پھر سے شروع ہوچکی ہے صرف پیٹرول کے دام بڑھ رہے ہیں۔ ہوائی جہازوں کے کرائے اور کم ہورہے ہیں ان میں بہت مقابلہ (Competition) ہے امریکا کی آبادی ہماری آبادی سے دگنی ہے، ہماری قومی ایئرلائن کے پاس غالباً 60 سے بھی کم طیارے ہیں امریکا میں درجنوں ایئرلائنیں ہیں صرف امریکن ایئرلائنز کے پاس ایک ہزار سے زیادہ طیارے ہیں اور تمام ایئرلائنوں کو ملا کر پندرہ ہزار سے زیادہ طیارے موجود ہیں۔ ہر ایئرپورٹ پر آنے اور جانے والوں کا ہجوم رہتا ہے اتفاق سے مجھے کاروبار کے سلسلے میں یورپ اور امریکا آنا جانا رہتا ہے تو یورپ کے مقابلہ میں امریکا بہت آگے ہے۔ یہاں دنیا کی ہر قوم موجود ہے یہ واحد ملک ہے جہاں ہر ملک کے قومی دن کا جشن منایا جاتا ہے۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں ہے۔ ہر ملک کے باشندے کھلے عام اپنی قومی تقریبات جشن کی شکل میں منعقد کرتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ یہاں صرف گرجا گھر نہیں ہیں بلکہ بدھ مذہب کے ٹیمپل، مسلمانوں کی مساجد، ہندوؤں کے مندر اور سکھوں

کے گردوارے اور یہودیوں کی عبادت گاہیں موجود ہیں اور ہر ایک کو اپنی اپنی عبادت گاہ میں نہ صرف عبادت کی اجازت ہے بلکہ ریاست کی طرف سے مذہبی جماعتوں کو امداد بھی ملتی ہے خاص طور پر موجودہ صدر بش نے تو مذہبی جماعتوں سے کہا ہے کہ وہ ہمارے بگڑتے ہوئے معاشرے کو اچھا بنانے کے لئے مذہبی رجحانات پیدا کریں۔ اور وہ مسلمانوں کے قرآنی اصولوں سے بہت متاثر ہیں۔ اس دورۂ امریکا میں مجھے ایک جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بہت بڑی مسجد تھی۔ بہت متاثر ہوا کہ تمام مسجد کا حصہ مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جس میں اہلسنت، اہل تشیع، اہلحدیث بشمول ہندوستانی، پاکستانی، ایرانی، عربی تمام قومیں شامل تھیں۔ بڑا متاثر کن مجمع تھا۔ جامع مسجد کے پیش امام کا تعلق ملک شام سے تھا۔ بہت مثبت طریقہ سے انگریزی میں خطبہ بیان فرمارہے تھے۔ انہوں نے اسلامیات میں پی ایچ ڈی کیا ہوا تھا۔ انداز بیاں اتنا اچھا تھا کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اختلافی مسائل سے ہمیشہ دور رہنے کی تلقین کرتے رہے اور ڈیڑھ گھنٹہ کا خطبہ دیا۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا اتنا ڈسپلن مجمع ہمہ تن گوش ان کی انگریزی زبان کے خطبہ میں ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ پتہ ہی نہیں لگا اور جمعہ کی نماز شروع ہوگئی۔ نہایت شگفتہ انگریزی کے ساتھ نماز جمعہ میں سب سے چھوٹی سورتیں جن کا مطلب تو بڑی بڑی سورتوں سے زیادہ بتایا گیا ہے، پڑھیں اختصار سے نماز جمعہ ختم کی سب سے اہم جملہ اس نماز جمعہ سے پہلے انہوں نے جو پڑھا وہ یہ تھا کہ آپ نماز کی نیت یہ سمجھ کر کریں کہ یہ آپ کی آخری نماز ہے۔ اس نماز کی دوسری بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر شخص نے اپنے اپنے طریقہ سے نماز ادا کی یعنی اہل تشیع مسلمانوں نے ہاتھ چھوڑ کر تمام نماز ادا کی کسی نے نہ تو کوئی اعتراض کیا جبکہ پیش امام کا تعلق اہلحدیث فرقے سے تھا۔ ان مسلمانوں میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل تھے۔ اکثریت بے شک اہلسنت کی تھی۔ کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ امام صاحب کا فقہ کیا ہے۔ ہر مسلمان ایک دوسرے سے خلوص کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے نماز ادا کرتا رہا اور آخر میں نماز جمعہ ختم ہونے کے بعد مسجد کے باہر آ کر ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ اتنا خلوص میں نے کسی اور جگہ نہیں دیکھا۔ نماز کے وقت اگرچہ مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ مگر کسی کے چہرے پر شکن نہیں تھی۔ ہر ایک کی کوشش یہی تھی کہ دوسرے مسلمان بھائی کو جگہ مل جائے۔ اگرچہ میں ان میں اجنبی تھا۔ مگر ہر ایک نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ پاکستان کے حالات پوچھے۔ نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ مسلمانوں کی اس یکجہتی سے بڑی خوشی ہوئی میں نے سوچا کہ ہمارے ملک میں ایک مسجد

میں تو صرف ایک ہی فقہ کے لوگ نماز پڑھتے ہیں اگر کوئی دوسرا شخص اس میں نماز پڑھنا بھی چاہے تو نہیں پڑھ سکتا۔ جبکہ امریکا میں آ کر یہ ہی پاکستانی یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے برابر میں شیعہ ہے، سنی ہے، اہلحدیث ہے، شافعی ہے، مالکی ہے۔ یہ عمل ہمارے ملک میں کیوں نہیں ہوسکتا۔ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ اس کا مالک صرف اور صرف اللہ ہے، اس کے ماننے والے آ کر اس کے گھر میں جس طرح چاہیں۔ عبادت کریں۔ کم از کم اس کے گھر کو تو آباد رکھیں۔ ان لوگوں سے تو بہتر ہیں جو نماز ہی نہیں پڑھتے۔ آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ایک دوسرے کے خون سے نہا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی مساجد پر حملہ کر رہے ہیں۔ آپس میں دشمنی گھٹانے کے بجائے ایک دوسرے سے دشمنی بڑھانے میں سبقت لے رہے ہیں۔ کیا اسلام نے ہمیں یہی سبق دیا ہے کہ ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان پر حرام ہونے کے باوجود ہر صبح، ہر شام کسی نہ کسی کا خون کیوں بہہ رہا ہے۔ کون بہا رہا ہے اور کب تک بہتا رہے گا۔ کیا پاکستان اسی لئے بنا تھا؟ کیا اسی کے لئے ہم نے قربانیاں اپنے اپنے آباؤ اجداد سے دلوائی تھیں؟ ہم اپنی اپنی سرحدوں سے نکل کر تو بھول جاتے ہیں کہ کون پاکستانی ہے، کون ہندوستانی ہے، کون شیعہ ہے، کون سنی ہے اور جب واپس ہم اپنے ملک میں آتے ہیں تو آتے ہی ہم پر شیعہ سنی اور اہلحدیث کی چھاپ کیوں لگ جاتی ہے۔ مسلمان تو صرف مسلمان ہے خانہ کعبہ، مسجد نبوی میں کیوں ایک ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ یورپ، امریکا، افریقہ میں تو نماز بلا تمیز ادا کرتے ہیں اور بڑے خلوص کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ یہ نہیں پوچھتے کہ یہ مسجد کسی فقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ صرف اور صرف مسجد دیکھ کر داخل ہو جاتے ہیں۔ مگر اپنے ہی ملک میں یہ تفریق کیوں؟ کیا ہمارے ملک کا خدا کوئی اور ہے، یورپ اور امریکا کا خدا کوئی اور ہے؟ نہیں ہم سب کا خدا تو صرف ایک ہی ہے مگر کوئی تو ہے، جو ہمیں تقسیم کر رہا ہے، ہمارے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کر رہا ہے، ہمارے علماء کرام آج بھی اس امریکا میں رہنے والے شام (Syria) کے عالم کی طرح صرف ایک سبق دیں کہ مسجد صرف عبادت کی جگہ ہے اور نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر نماز پڑھے کہ یہ اس کی آخری نماز ہے۔

12th July, 2001

بلدیاتی نظام کس کے تابع ہوگا

جب بھی ہمارے ملک میں فوجی حکومت برسر اقتدار آئی ہے اس نے اپنی مرضی کی سیاست لانے کی کوشش کی جس کی چند مثالیں عوام کی یاد تازہ کرنے کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ سب سے پہلی مثال پہلی فوجی قیادت صدر ایوب خان نے بیسک ڈیموکریسی (Basic Democracy) کے نام سے متعارف کروائی۔ جسے بی ڈی (B.D.) نظام کا نام دیا گیا۔ غالباً اس زمانے میں جب مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں سے چند ہزار نمائندے عوام نے ووٹ دے کر چنے تھے اور ان نمائندوں نے صدر کو منتخب کرنا تھا۔ کیونکہ پورے عوام کو خریدنا یا دھمکانا مشکل کام تھا مگر ان کے نمائندوں سے آسانی سے دھمکا کر ووٹ لیا جا سکتا تھا۔ مگر جس نظام میں اصل عوام کا حصہ اور نمائندہ نہ ہو وہ نظام جلد ہی اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ لہٰذا پہلی ہی فرصت میں یہ بی ڈی نظام فیل ہو گیا اور اپنی موت آپ مر گیا۔

یحییٰ خان آئے انہوں نے ایک آدمی ایک ووٹ کا نعرہ لگایا جو حقیقت میں صحیح تھا۔ عوام نے سیاسی جماعتوں کو بھرپور ووٹ ڈالے اور اپنے نمائندے چن لئے۔ مگر جب صدر یحییٰ خان نے دیکھا۔ ان کی صدارت جاری ہے تو انہوں نے آدھا ملک دے دیا۔ مگر صدارت نہیں دی۔ اگر یحییٰ خان اقتدار شیخ مجیب الرحمان کے حوالے کر دیتے تو ایک طرف جمہوریت پروان چڑھتی تو دوسری طرف ہمارا ملک دولخت نہ ہوتا۔ چند سال کے لئے جمہوری دور آیا۔ عوام کو راس نہیں آیا اور بھٹو صاحب کو رخصت کر دیا گیا۔

پھر ضیاء الحق برسر اقتدار آئے۔ پہلے انہوں نے مجلس شوریٰ کا نظام متعارف کروایا اور اپنی ہی پسند کے نمائندے مجلس شوریٰ میں نامزد کر دیئے۔ کافی عرصہ یہ نظام چلتا رہا پھر خود ہی ضیاء الحق صاحب نے مجلس شوریٰ کو برخاست کر کے غیر سیاسی بنیاد پر الیکشن کروا کر اپنے مطلب کا وزیر اعظم نامزد کر دیا۔ اس قومی اسمبلی کے نام

نہاد غیر سیاسی ممبران نے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو بلا چون و چرا وزیر اعظم منتخب کر کے لنگڑی لولی جمہوری قومی اور صوبائی اسمبلیاں بحال کروالیں۔ مگر جب صدر اور وزیر اعظم میں کھٹ پٹ ہونے لگی تو صدر ضیاء الحق صاحب نے خود اپنے نامزد بے ضرر وزیر اعظم کو بھی برخاست کر دیا اور اسمبلی کو بھی چلتا کر دیا اور عجیب وغریب ریفرنڈم کروا کر خود 95 فیصد ووٹ لے کر پانچ سال کے لئے صدر بھی اپنے آپ کو منوالیا۔ ابھی وہ کسی نئے نظام کو متعارف کروانے والے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشا سے حادثہ کا شکار ہو گئے۔ وہ نظام ادھورا رہ گیا۔

پھر چند سال کے لئے جمہوری دور آیا اور بھاری مینڈیٹ اقتدار کے سمندر میں ڈوب گیا۔ تنگ آئے ہوئے عوام نے موجودہ جنرل پرویز مشرف صاحب کی پذیرائی کی۔ پہلے انہوں نے اپنے آپ کو چیف ایگزیکٹو (CEO) کہلوایا۔ مگر جب سپریم کورٹ نے تین سال کا ہدف دیا تو انہوں نے اسمبلیاں، سینیٹ کو ختم کر کے ترامیم کے ذریعے اپنے آپ کو صدر پاکستان بنوالیا۔ عوام کو اس سے غرض نہیں تھی اور نہ ہے۔ چاہے وہ خود کو چیف ایگزیکٹو کہلوائیں یا صدر پاکستان۔ انہیں تو ایک نجات دہندہ کی ضرورت تھی اور ہے۔ اس لئے وہ خاموش تماشائی بنے رہے کہ موجودہ حکومت کیا کرتی ہے۔

ماضی کی فوجی حکومتوں کی طرح موجودہ حکومت نے بھی رفتہ رفتہ اقتدار منتقل کرنے کے لئے اس نئے بلدیاتی نظام تحصیل اور ڈسٹرکٹ (ضلع) کی سطح سے متعارف کروایا۔ جس میں ناظم، نائب ناظم، یونین کونسل، ٹاؤن کونسل کے اراکین منتخب کروا کر عوامی نمائندوں کو زیادہ با اختیار بنانا چاہتی ہے یہ عجیب وغریب نظام بھی چند پیچیدگیوں کا شکار ہوتا نظر آ رہا ہے کہ آئے دن اس میں ترامیم ہو رہی ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ الیکشن کروانے سے پہلے اس کا اہل اور نا اہل کا تعین کر لیا جاتا اور یہ تمام الیکشن ایک ساتھ پورے ملک میں کروائے جاتے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ ہر صوبے میں الگ الگ تاریخیں مقرر کی گئیں۔ نہ الیکشن لڑنے والے امیدوار کو یہ بتایا گیا کہ وہ سیاسی وابستگی رکھ سکتا ہے یا نہیں۔ الیکشن ہوتے گئے۔ ناظم، نائب ناظم اراکین ٹاؤن کونسل، یونین کونسل جب منتخب ہو گئے تو ہر گروپ نے سیاسی وابستگی بنا کر ووٹ حاصل کئے تھے۔ ہر سیاسی جماعت نے اپنے امیدوار کو بظاہر غیر سیاسی لیبل لگوا کر میدان میں اتار دیا اور جب انہیں نمائندوں کی سیاسی وابستگی کی تشہیر شروع ہوئی۔ ہر گروپ نے بڑے بڑے دعوے کرنے شروع کر دیئے تو غالباً حکومت ان دعوؤں سے بوکھلا گئی اور ایک ترمیم کے ذریعے سیاسی وابستگی کا نوٹیفکیشن نافذ کر دیا اور اس کی رو سے سیاسی وابستگی رکھنے والا کامیاب

امیدوار چار سال کے لئے نا اہل ہو جائے گا۔ گویا اہل ہونے سے پہلے ہی نا اہل ہو گیا۔ انتظامیہ کیا سو رہی تھی۔ جب عوام ووٹ ڈال رہے تھے اور ہر کوئی اپنے کسی سیاسی جماعت کے لیبل والے امیدوار کو ووٹ ڈال رہا تھا۔ پھر جب ان سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے جیتنے والے امیدواروں کا اعلان اور استقبالیہ دینے شروع کئے تو حکومت نے فوراً غیر سیاسی وابستگی کا نوٹیفکیشن نکال دیا۔ بھلا آج کے ترقی پذیر دور میں کوئی ایسا شخص ہو گا جس کی کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے ہمدردی، وابستگی نہیں ہو گی۔ یقیناً اس نے اسی ہمدردی یا ہم خیالی، وابستگی کی وجہ سے ہی اس امیدوار کو ووٹ دیا ہو گا۔ خاص طور پر جبکہ ہمارے ملک میں سیاسی جماعتوں کی نمائندہ اسمبلیاں، سینیٹ دنوں ہی برخاست ہو چکی ہیں لنگڑی اور لولی سیاسی وابستگی یا ہمدردی تو عوام کا بنیادی حق ہے۔ اس سے محروم نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر ایسا کرنا ہی مقصود تھا تو اس کا باقاعدہ پہلے نوٹیفکیشن آنا چاہئے تھا۔ یہی نہیں بلکہ ناظم اور نائب ناظم کو 50 فیصد اراکین کی حمایت کا نوٹیفکیشن بھی مشکوک نظر آ رہا ہے۔ ایسی سیاسی جماعتوں کا اس موقع پر احتجاج اور واویلا کرنا حق بجانب ہے جو کام پہلے کرنا چاہئے وہ الیکشن کے رزلٹ آنے کے بعد کرنے کا کیا جواز رکھتا ہے۔

تیسرا اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ حکومت جب چاہے جس کو چاہے برطرف کر سکتی ہے۔ اگرچہ برطرف کردہ منتخب امیدوار کو موقع صفائی دیا جائے گا۔ مگر عوام کو معلوم ہے ہمارے قوانین میں بے شمار شقیں ہیں جن سے وہ تمام نتائج حاصل ہو جائیں گے۔ گو منتخب نمائندہ بیوروکریسی کی لٹکائی ہوئی تلوار کے نیچے ہی لٹکا رہے گا۔

دوسری راہ بیوروکریسی نے یہ بھی نکالی ہوئی ہے۔ جیتنے والے امیدوار ابھی تک انتظار میں بیٹھے ہیں گویا کوئی اس نظام میں اتنی دیر کیوں کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے امیدواروں نے ان اعلانات پر شکوک وشبہات کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ الیکشن کمیشن کو چاہئے کہ اس تاخیر کی تحقیقات کروا کر اس مخمصہ کو دور کرے۔ یہ اس حکومت کی نیک نامی کرے گی اور اگر کسی نے دھاندلی کروائی ہو تو اس کو ختم کرے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ نظام اتنی قانونی ترامیم کے بعد اپنی اصل افادیت کھو چکا ہے اور بیوروکریسی اس نظام میں مزید Notification لا کر اس کو ادھ موا کر دے گی اور ماضی کے متعارف کردہ نظاموں سے یہ نظام بھی ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ ایک طرف تو ناظم کو با اختیار بنایا گیا ہے تو دوسری طرف ناظم کو بیوروکریسی کی اختیاری Power کے تابع بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس نظام کا اصل مقصد تو بیوروکریسی کو لگام دے کر عوامی نظام کے تابع کرنا تھا۔ اللہ ہی جانے کس نے کس کو تابع کر دیا ہے۔

20th July, 2001

ہندوستان کو ایک ڈیگال کی ضرورت ہے

میرے حالیہ امریکا میں قیام کے دوران بہت سے پاکستانی دوستوں سے ملاقات رہی۔ ہر کوئی پاکستان کی موجودہ صورت حال کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھا اور سب کا موضوع اس دفعہ ہندوستان اور پاکستان کے مذاکرات کے بارے میں کافی حوصلہ افزا تھا اور وہ یہ دعوت نامہ چونکہ بھارتی وزیراعظم واجپائی صاحب کی طرف سے پرویز مشرف صاحب کو ملا تھا جس سے کم از کم یہ تاثر ضرور پایا جاتا تھا کہ اب ہندوستانی حکومت مسئلہ کشمیر کو حل کرنا چاہتی ہے۔ اسی لئے اس نے مذاکرات کی دعوت دی ہے اور اس میں وہ سنجیدہ بھی نظر آتا۔

ایک کاروباری میٹنگ ختم ہونے پر ایک امریکی فرم کے صدر نے مجھے رات کھانے پر مدعو کیا۔ اس کے ساتھ اس کمپنی کے کئی اور ڈائریکٹرز بھی اس کھانے میں شامل تھے۔ گفتگو کے دوران اس فرم کے صدر نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے مجھ سے ایک سوال کیا ہم پاکستانی اور ہندوستانی اچھے پڑوسی کے بجائے ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہیں اور غربت، جہالت کے باوجود ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں اور کشمیر کا مسئلہ کیوں حل نہیں کر لیتے۔ ان تین سوالوں کا جواب میں نے کچھ اس طرح دیا کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہیں یہ آپ اپنی حکومت سے پوچھیں جو ہم کو ایک نہیں ہونے دینا چاہتی ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کی معیشت پر قبضہ کرے۔ اپنا اسلحہ بیچنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ہندوستان کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔ اس کی مالی اور اخلاقی مدد کرتے ہیں۔ ہر دفعہ مسئلہ کشمیر پر ویٹو کروا دیتے ہیں۔ کشمیر کے مسئلہ پر ہندوستان کا ساتھ دیتے ہیں۔ مظلوموں کا اگر وہ ساتھ دے دیں تو بھلا ہندوستان کی کیا مجال ہے کہ کشمیر میں اقوام متحدہ کی قراردادیں منظور ہونے کے باوجود آج پچاس سال سے ان پر عمل درآمد نہیں

کرا سکا۔ جبکہ انڈونیشیا میں صرف ایک ماہ کے اندر ہی انہوں نے ایک جزیرہ کو آزاد کروا دیا کیا وہ کشمیری عوام کا ساتھ دے کر ان کو ہندوستان سے آزاد نہیں کروا سکتا۔ پھر میں نے تقسیم وقت پر ہونے والے معاہدہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی، تمام ڈائریکٹرز بہت حیرت سے تاریخی واقعات خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر میں کہنے لگے۔ امریکی عوام ان تمام باتوں جو میں نے انہیں بتائیں ہیں وہ ان سے ناواقف ہیں اور پاکستان کا سفارتخانہ کیوں ہمارے عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کر کے کشمیر کے موقف پر سیمینار اور دیگر ذرائع ابلاغ سے تشہیر کر کے ہمدردیاں حاصل کرے۔ ورنہ ہم پاکستان کو اس معاملہ میں جھگڑالو سمجھتے تھے۔ جبکہ ہندوستان ہمیشہ اپنے ذرائع ابلاغ سے امریکی عوام کی ہمدردیاں سمیٹتا رہا ہے۔ پاکستان واپس آ کر اتفاق سے میں اپنا کالم لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ یہ امریکا سے میرے اسی امریکی دوست کا فون تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے امریکی ٹی وی سے پاکستان کے صدر پرویز مشرف صاحب کا اخبار نویسوں سے ریکارڈ کیا ہوا انٹرویو سنا۔ یہ اس بہت بڑے امریکی فرم جو انٹرنیٹ کے کاروبار سے منسلک ہے فرد کے الفاظ ہیں کہ ہم کو صحیح معنوں میں آج مسئلہ کشمیر کے بارے میں آگاہی ہوئی ہے اور جس نے بھی یہ انٹرویو دیکھا ہوگا وہ پاکستان کی حمایت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نے کہا جس احسن طریقہ سے ہمارے صدر نے اخبار نویسوں کے سوالات کے جوابات دیئے ایسا لگتا تھا کوئی مفکر کسی الجھے ہوئے مسئلے کو بردباری اور خوش اخلاقی سے ایک جنرل ہوتے ہوئے اصولی سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے۔ جس میں ہٹ دھرمی یا جھنجلاہٹ فوجی دبدبہ نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ آپ کے صدر نے اپنے کیس کو اپنی اعلیٰ ذہانت سے اب ہندوستان کے کورٹ میں ڈال دیا ہے۔ اب ہندوستان کو اس مسئلہ کا حل ہر صورت میں پیش کرنا ہوگا اور دنیا کے جن جن ممالک میں یہ انٹرویو دکھایا جائے گا یقیناً وہاں کے عوام کی ہمدردیاں پاکستان کے حق میں تبدیل ہو جائیں گی۔ آپ کی وزارت اطلاعات اور سفارتخانوں کو چاہئے کہ بڑے پیمانے پر ہر ملک میں اس انٹرویو کی تشہیر کا بندوبست کر کے رائے عامہ کو بیدار کریں۔ تاکہ وہ اصل مسئلہ کی طرف توجہ دے کر اس مسئلہ کشمیر کو جلد از جلد حل کروانے میں پاکستان کی اخلاقی مدد کریں۔

انٹرویو میں نے بھی دیکھا تھا۔ واقعی ایک منجھے ہوئے سیاستدان کی طرح دھیمے لہجے میں ایک فوجی اپنے موقف کو اخبارات کی دنیا میں بیٹھ کر منوا کر اٹھے۔ یہ بڑی بات تھی۔ مگر وزیراعظم واجپائی اور ان کی کابینہ نے اعلان آگرہ جاری نہ کر کے پاکستان ہی کو نہیں پوری دنیا کا مایوس کیا ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ خود بھارتی

حکومت صرف۔ بی جے پی کی اکیلی تو نہیں ہے۔ وہ بھی مخلوط حکومت ہے جس میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ جن میں انتہا پسندوں کا گروپ بھی اور خود بی جے پی ایک زمانہ میں خود انتہا پسند تھی۔ بابری مسجد کا واقعہ کس طرح بھلایا جاسکتا ہے، خود ہندوستانی، وزیراعظم نے دعوت دی۔ پاکستان نے خندہ پیشانی سے اس دعوت کو قبول کیا۔ یہ بات بھی قابل مبارکباد ہے کہ کسی بھی لمحہ ماحول کی فضا مثبت ہی رہی۔ ہندوستان اور پاکستان کی طرف سے بات چیت کے دوران یا کسی بھی مرحلہ میں تناؤ نہیں آیا۔ بلکہ جب ہندوستان کے وزیر خارجہ نے اعتراف کیا کہ بات چیت ناکام نہیں ہوئی ہے۔ اس سے ہندوستان سبکی سے بچ گیا۔ پھر پاکستان کی طرف سے دعوت نامہ قبول کرنا مایوسی کے عالم میں روشنی کی جھلک دکھا رہا ہے کہ ہندوستان آہستہ آہستہ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ ایک دم مسئلہ کشمیر حل کرنے سے اس کے دیگر صوبوں کے مسائل خاص طور پر خالصتان، ناگالینڈ، تامل ناڈ کی آزادی کا سوال اٹھ سکتا ہے مسئلہ صرف کشمیر تک محدود نہیں رہے گا۔ اگر وزیراعظم واجپائی جلد ہی پاکستان کا دورہ کریں اور ہماری وزارت خارجہ کا دورہ بھی ہوتا رہے تو مسئلہ کشمیر جلد حل ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہم کو دیگر مسائل پر بھی توجہ دینی چاہئے کیونکہ ہندوستانی وزیراعظم بہت کچھ پاکستان سے خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں۔ کم از کم وہ تیکھا رویہ تو ختم ہوا۔ ہم تجارت شروع کر کے کم از کم کشیدگی کو ختم کر سکتے ہیں۔ اس سمٹ (Summit) سے پاکستان کو اخلاقی فتح ہو چکی ہے کہ تین دن کی زبردست تشہیر سے مسئلہ کشمیر چاہے اس کو کوئی نام دیں بہت آگے آچکا ہے۔ دنیا کا کوئی ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبار ایسا نہیں ہوگا جس میں اس آگرہ کانفرنس کا ذکر نہ ہوا ہو۔ جو کام ہم 53 سال میں نہیں کر سکے۔ صدر پرویز مشرف نے صرف تین دن میں دنیا کو آگاہ کر دیا ہے۔ ہندوستان اب نہ چاہتے ہوئے بھی اس مسئلہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ البتہ دیر کر سکتا ہے، اندھیر اب ممکن نہیں رہا۔ ہندوستان کو ایک ڈیگال جیسے لیڈر کی تلاش ہے خود وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی صاحب بھی ڈیگال جیسی سوچ رکھتے ہیں۔ صرف عمل کی ضرورت ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کر دیا تو وہ تاریخ میں امر ہو جائیں گے۔ جس سے دونوں ملکوں کو نہیں پورے ایشیا کو فائدہ پہنچے گا۔ کاش ایسا ہو جائے تو بی جے پی کا بابری مسجد والا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ کشمیریوں کو سکھ اور چین نصیب ہو جائے گا۔ آخر میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی دوستی کی مثال بھی دے دوں۔ جو میں نے شکاگو امریکا میں دیکھی۔ ایک سڑک کا نام ڈاؤن اسٹریٹ ہے۔ جس کو ہندوستانی اور پاکستانی دیوان اسٹریٹ بھی کہتے

ہیں۔ اس اسٹریٹ کا آدھا حصہ گاندھی ایونیو کہلاتا ہے اور آدھا حصہ جناح ایونیو کہلاتا ہے۔ اس اسٹریٹ پر کھانوں کے ریسٹورنٹ ہیں۔ ہمارے پاکستانی بھائیوں نے اپنے ریسٹورنٹ کے نام پاکستانی ریسٹورنٹ کے ناموں پر رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں صابری کی نہاری، اسٹوڈنٹ کی بریانی، پھجے کے پائے، بندو خان کا کباب پراٹھا، طباق، گھسیٹے خان کا حلیم وغیرہ وغیرہ رکھ کر کراچی کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ویک اینڈ پر اس اسٹریٹ پر چلنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ تمام ہندوستانی اور پاکستانیوں کی دکانیں ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں بننے والی ہر اشیاء مل جاتی ہیں۔ یہ دونوں کے تہوار میں سجائی جاتی ہیں۔ آپ کو یہ فرق نہیں لگے گا کہ اس میں کون پاکستانی ہے اور کون ہندوستانی ہے۔ آج تک کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوتا۔ دونوں اپنے اپنے ملک کے یوم آزادی بڑی شان سے مناتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جلسے جلوس کارنیوال، عید، ہولی سب تہواروں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں اور یہ امریکن یقیناً سوچتے ہوں گے کہ اپنے اپنے ملک میں یہ ایک دوسرے کے کٹر دشمن اور ہمارے ملک میں سجنوں کی طرح رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے کوئی ہمارے سیاست دانوں سے پوچھے۔

27th July, 2001

بوڑھی ماں

بستر علالت پر ایک چون (54) سالہ بوڑھی ماں لیٹی ہوئی ہے۔ جس کے پانچ بیٹے اور چودہ کروڑ دعویدار تھے ان پانچ بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو اس کی جوانی میں ہی زبردستی الگ کر دیا گیا تھا۔ جس کا صدمہ آج بھی اس کو اداس کر دیتا ہے، مگر حالات کے آگے وہ خاموش رہنے پر مجبور ہے میں نے اس بوڑھی ماں سے پوچھا کہ تم کو اس حالت پر کس نے پہنچایا۔ تو اس نے گھور کر میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کیا تم بھی اس کے ذمہ دار نہیں ہو۔ میں نے پہلو بدل کر دوبارہ پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ ماضی میں کھو گئی اور اس نے اپنی داستان حسرت سنانا شروع کر دی کہ میں وہ ماں ہوں جس نے اپنوں کے لئے خود اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ اپنی اولادوں اور چاہنے والوں کو اپنی دھرتی سے کون کون سے ثمر نہیں دیئے۔ شروع ہی سے لٹی مامتا کے ہاتھوں سب بیٹوں اور چاہنے والوں کو رہنے کو چھت، کھانے کو تمام انواع قسم کے پھل، سبزیاں، اناج پیدا کئے۔ پہننے اوراوڑھنے کے لئے نئے نئے کپڑے اور ملبوسات مہیا کئے مگر اس کے پانچ ناشکرے بیٹے بھائیوں کی طرح رہنے کے بجائے ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے۔ ایک بھائی کے کم ہو جانے کا کسی کو بھی غم نہیں ہے بلکہ بس چلے تو سب الگ ہونے کے لئے تیار بیٹھے ہیں صرف اس بڑھیا کی موت کا انتظار ہے اور وہ دکھیاری موت کے منہ میں جا کر کئی دفعہ واپس آ چکی ہے۔ کوئی اس کا ہمدرد بنا پھر رہا ہے مگر اس کے علاج کے لئے کوئی تیار نہیں ہے کہ اگر کوئی ہے بھی تو اس کا علاج نہیں کرنے دیتا۔ ہر کوئی اس کو دکھ دینے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ خود اس کے منہ پر اس کی برائی گنوانے کے لئے آگے آگے ہے۔ ایک ماں وہ بھی دکھی اس کو لوٹنے والے کروڑوں ہوں تو کون سی بیماری ہوگی جو اس کو نہیں لگ چکی ہوگی۔ مگر وہ پھر بھی اس سے امیدیں لگائے بیٹھی ہے کہ کوئی تو ہوگا جو اس کا دکھ درد کا ساتھی بنے گا۔ کوئی تو ہوگا جو اس کی بھلائی کے لئے آگے بڑھے گا۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھے گا۔ مگر

افسوس صد افسوس امید کی کرنیں ڈوب رہی ہیں اور اس کی آنکھیں پتھرا رہی ہیں۔ ہر کوئی اس کو چھوڑ کر دور جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھ رہا ہے۔ چاہے اس کو فاقے ہی کیوں نہ کرنے پڑیں۔ بلا سے اس کو اس سرزمین پر بسنے والوں کے طعنے ہی کیوں نہ سننے پڑیں۔ اس ماں کے آغوش میں سکون سے رہنے کے باوجود وہاں سرد اور گرم راتیں کھلے آسمان تلے کیوں نہ گزارنی پڑیں۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے اپنے بھی آپس میں لڑ لڑ کر الگ کیوں نہ ہو جائیں۔ خود اس کی اولاد اس کی اپنی نہ رہے مگر اس پر تو دیار غیر کا جنون سوار ہے۔ اس کے لئے اس کی ماں کی تمام زندگی کی کمائی اس کی بیوی کے ارمان اس کے بچوں کا مستقبل بھی وہ داؤ پر لگانے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ آخر وہ کیا کشش ہے جو اس کو اپنی پیاری محبت کی ماری بیمار اور بوڑھی ماں سے دور کرنے کے درپے ہے۔ آرام دہ زندگی سے وہ کیوں راہ فرار اختیار کر رہا ہے آخر کچھ تو وجہ ہوگی جو اپنے برتن صاف کرنے کے بجائے دوسروں کے جھوٹے برتن صاف کرنے کو ترجیح دے رہا ہے۔ اس دھرتی کی سستی اور آسان زندگی کے بدلے مہنگی اور سخت زندگی گزارنے کی تیاری کر رہا ہے کہ ہر کوئی اس ماں کو دکھ دینے اور کوسنے پر کمربستہ ہے، اس بیمار ماں کو بستر پر آرام دینے کے بجائے اس کے بستر کو پٹخ رہا ہے، اس کی تیمارداری اور غم خواری میں ساتھ دینے کے بجائے اس پر مزید مصیبت کے پہاڑ کھڑے کر رہا ہے، اس ماں کے دکھڑے سن کر میرا قلم بھی لرز رہا ہے۔ بھلا ایسی بھی کوئی اولاد ہو سکتی ہے، جو ماں کی دی ہوئی تمام نعمتوں کو ٹھکرا کر احسان فراموشی کی راہ پر چل نکلے۔ جس کو اپنے اور غیر کی تمیز ختم ہو جائے۔ اس بے کس اور بے بس ماں کو جسے خود ہم نے ہی اپنے ہاتھوں اس حالت میں پہنچایا ہے۔ اس سے معافی مانگنے کے بجائے اس کو اور تنہا کر دینے کے درپے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے۔ ہماری عقلوں کو کس کے تالے پڑے ہیں۔ دور کے ڈھول ہمیں کیوں اتنے سہانے لگنے لگے ہیں۔ کیسی بھی ماں ہو۔ ماں پھر ماں ہے۔ کجا ایسی شفیق بے ضرر ماں کہاں ملے گی۔ جاؤ دنیا چھان مارو۔ آخر ایک نہ ایک دن تم کو پچھتا کر تو واپس آنا ہی پڑے گا۔ یہ کرنسیوں کی جھنکار سدا نہیں رہتی۔ اب بھی وقت ہے اس بیمار ماں کی خدمت کر کے اس کو دوبارہ سہاگن بنا دو۔ آپس میں شیر و شکر بن کر رہو۔ اس دکھیاری ماں کو مزید دکھ نہ دو۔ قدرت کا اٹل فیصلہ ہے۔ اگر تم اس کے نہیں رہے تو اپنے بھی نہیں رہو گے۔ اس کی عزت نہیں کی تو تمہاری بھی کوئی عزت نہیں رہے گی۔ کیونکہ تم اس کی پہچان ہو۔ بھلا اپنی پہچان سے کوئی بے وفائی کر سکتا ہے، بے شک زیادہ آرام دہ زندگی نہ سہی۔ ماں کی آغوش میں راحت ہی راحت ہے۔ ایسی راحت جو

خریدی نہیں جاسکتی اور اگر چھن جائے تو دوبارہ میسر نہیں آسکتی۔ یہ ماں یہ دکھیاری ماں میرا پیارا پاکستان ہے۔
آنکھیں کھول کر دیکھو قرآن میں جن جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ جن جن پھلوں، پھولوں، خوبصورت پہاڑوں،
چشموں، دریاؤں اور سمندروں کیا کچھ اس دھرتی میں نہیں ہے کہ اور اس کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

25th December, 2001

اوپر کا بٹن

ایک سردار جی اپنے بیٹے کو گھمانے ہندوستان سے انگلینڈ لے گئے۔ وہاں سردی کا موسم تھا۔ انہوں نے ایک سوٹ خرید کر اپنے بیٹے کو پہنا دیا۔ جس نے کبھی سوٹ نہیں پہنا تھا۔ ایس گھومنے میں شام ہوگئی۔ لڑکے کو بیت الخلاء کی حاجت ہوئی۔ لندن میں جگہ جگہ سرکاری بیت الخلاء بنے ہوئے ہیں۔ لڑکے کو بیت الخلاء لے گئے۔ جب وہ بیت الخلاء سے فارغ ہوکر باہر نکلا تو کبڑا ہوگیا تھا۔ سردار جی لڑکے کو اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہوگئے۔

زیادہ انگریزی بھی نہیں آتی تھی۔ نئے نئے لندن آئے تھے تو کوئی واقف کار بھی نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک اور ہندوستانی پاس سے گزرا تو سردار جی نے اپنے کبڑے لڑکے کو ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے کسی ہندوستانی ڈاکٹر کا پتہ پوچھا۔ اس ہندوستانی نے نزدیک ہی ایک ہندوستانی ڈاکٹر کا پتہ بتلا دیا سردار جی اپنے لڑکے کو لے کر اس ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ وہ ڈاکٹر بھی سردار تھا۔ سردار جی نے ڈاکٹر کو بتایا کہ ان کا لڑکا جب بیت الخلاء گیا اس وقت تک ٹھیک تھا مگر وہاں سے فارغ ہوکر جب باہر آیا تو وہ کبڑا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے سردار جی سے کہا کہ میں اس لڑکے کو ٹھیک کردوں گا مگر اس کے لئے سو پاؤنڈ لوں گا۔ سردار جی نے کہا میں بھی ہندوستانی ہوں۔ سو پاؤنڈ زیادہ ہوتے ہیں میرے لئے کچھ کم کرو۔ اس نے کہا چلو تم پچھتر پاؤنڈ دے دو۔ سردار جی مان گئے۔ ڈاکٹر لڑکے کو اندر لے گیا اور دو منٹ کے بعد جب لڑکا باہر آیا تو ہنستا کھیلتا سیدھا ہو چکا تھا۔ خیر سردار جی اس کو ہوٹل لے آئے۔ دو تین دن بعد پھر لندن گھومنے نکلے۔ راستے میں پھر ان کے لڑکے کو حاجت ہوئی۔ وہ اس کو سرکاری بیت الخلاء میں لے گئے۔ جب بیت الخلاء سے واپس آیا تو پھر کبڑا ہو چکا تھا۔ سردار جی پھر اسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر اس کو اندر لے گیا۔ واپس لایا تو وہ پھر سیدھا ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے سردار جی سے پھر

پچھتر پاؤنڈ فیس لے لی۔ سردار جی اس لندن والی بیماری سے پریشان ہوگئے۔ ساتھ ساتھ حیران بھی تھے کہ ہمارا ہندوستانی ڈاکٹر کتنا اچھا ڈاکٹر ہے کہ دو منٹ میں کبڑے کو سیدھا کر دیتا ہے۔ سردار جی نے سوچا یہ لندن میں بار بار کبڑے کا علاج کروا کر تو وہ کنگال ہو جائیں گے۔ تو کیوں نہ ڈاکٹر سے کبڑے کو سیدھا کرنے کا علاج پوچھ لوں ڈاکٹر بھی ہوشیار تھ۔ اس نے پہلے تو منع کیا پھر کہا۔ اچھا علاج بتانے کا 500 پاؤنڈ معاوضہ لوں گا۔ سردار جی بڑے گڑگڑائے۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ آخر معاملہ آدھے آدھے پر یعنی ڈھائی سو پاؤنڈ پر طے ہوا اور ڈاکٹر نے سردار جی کو کہا بیوقوف تمہارا بیٹا جب بیت الخلاء سے نکلتا ہے تو کوٹ کے اوپر کا بٹن نیچے والے سوراخ میں لگاتا ہے اسی وجہ سے کبڑا ہو جاتا ہے۔ بیوقوف آئندہ جب بھی یہ ایسا کرے تو بٹن کھول کر نیچے والے سوراخ میں لگانے کے بجائے اس کے سامنے والے سوراخ میں لگا دینا۔ بس اتنی سی بات ہے یہی حال اس وقت ہماری قوم کو درپیش ہے وہ ہے آیا بارات کا کھانا دینا چاہئے یا ولیمہ کی دعوت ہو یا نہ ہو۔ ہو تو ون ڈش (One Dish) ہو یا زیادہ سے زیادہ دو ڈشیں ہوں۔ نواز شریف حکومت نے غربت مکاؤ پروگرام کے تحت دعوت کے کھانے پر پابندی لگائی تھی۔ یہ ایک عجیب فیصلہ تھا کہ گھر کی چار دیواری میں آپ کھانا کھلا سکتے ہیں۔ مگر شادی ہال، ہوٹل، ریسٹورنٹ، پبلک پلیس پر آپ کھانا نہیں کھلا سکتے۔ شروع شروع میں شادی ہالوں، ہوٹل، ریسٹورنٹ والوں نے صرف مشروبات ہی پیش کیں مگر ان تقریبات میں شرکت دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ صرف بوتل یا آئس کریم کھانے رات بارہ بجے تک کون رکتا۔ میزبان بھی پریشان جو شادی ہال 700 افراد کا بک ہوتا تھا اس میں بمشکل دو ڈھائی سو افراد آتے تھے۔ اسی مناسبت سے لوگوں نے بکنگ کروانا شروع کر دیا تھا۔ اس سے ملحقہ کاروبار مثلاً جیولری، کپڑے، جوتے، کاسمیٹکس کھانے کی اشیاء وغیرہ متاثر ہو گئے تھے۔ مگر دام کسی کے بھی کم نہیں ہوئے بلکہ گوشت، سبزی، روٹی کی قیمتوں میں تو اضافہ ہوتا گیا۔ امیر لوگ تو اپنے اپنے بنگلوں میں طرح طرح کے کھانے پیش کرتے رہے۔ 5 اسٹار ہوٹلوں میں ولیمہ یا بارات کے بجائے کاروباری ریسپشن (Reception) کے نام پر بکنگ ہوتی گئی اور شادی ہالوں میں بھی آہستہ آہستہ یہ پابندی غیر موثر ہو گئی تھی۔ پھر یکا یک صرف کراچی میں اس پابندی پر عمل درآمد کرنے کے لئے شادی ہالوں پر چھاپے مارے گئے۔ جہاں دولہا ملا وہاں پر دولہا کو اور شادی ہال کی انتظامیہ کو گرفتار کر کے رات تھانوں میں رکھا گیا اور صبح جرمانہ ادا کرنے پر چھوڑ دیا گیا۔ اسلام میں بھی ولیمہ یا شادی کے کھانوں پر کوئی پابندی نہیں ہے

بلکہ ولیمہ کو مسنون بتایا گیا ہے پھر سب نے دیکھ لیا کہ پابندی سے قیمتوں یا شادی کے بجٹ میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ کئی جگہ تو لڑکی والوں کو طعنے بھی سننے پڑے کہ پابندی کی آڑ میں کھانے کے پیسے بچائے جا رہے ہیں۔ بہت سے منچلے لڑکے والوں نے لڑکی والوں سے کھانے کے بدلے نقدی بھی وصولی کر لی۔ جب بنیادی مقصد فوت ہو جائے تو ایسی پابندی سے کیا فائدہ۔ شادی زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہوتی ہے جو یادگار بھی رہتی ہے اور جب اسلام میں پابندی نہیں تو آپ اس موقع کو کیوں خراب کرنے پر تلے ہوں اور پابندی بھی جزوی تھی یعنی گھروں میں آزادی اور شادی ہالوں میں پابندی۔ امیروں کو آزادی اور غریبوں پر پابندی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ون ڈش کی آزادی ہونی چاہئے۔ زیادہ ڈشوں کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اول تو جب کھانا کھلانے کی اجازت ہوگی تو یہ ون ڈش بھی غیر موثر ہو جاتی ہے ایک کے بعد دو۔ دو سے تین۔ پھر ہماری قوم تو کھانے کے معاملے میں سب سے آگے ہے۔ عملی طور پر اگر ایک یا دو کھانے رکھے جائیں تو مشکل سے 20 فیصد فرق پڑتا ہے کیونکہ جو روٹی کھا رہا ہے۔ تو چاول بچیں گے مرغی کھا رہا ہے تو سالن بچے گا یعنی مجموعی طور پر جتنا کھانا ہے۔ خواہ وہ ایک کھانا ہو یا پانچ کھانے ہوں، پیٹ جتنا خالی ہوگا اتنا ہی کھایا جائے گا۔ دیگر لوازمات جو اس سے بھی زیادہ مہنگے ہیں ان پر کوئی پابندی۔ مثلاً شادی کا جوڑا، جہیز کا سامان، مہنگے مہنگے تحائف کا تبادلہ، وہ بھی تو شادی کا ہی حصہ ہے پھر اسی بہانے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو طرح طرح کے کھانے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حالات جاننے کا موقع ملتا ہے اس سے ملحقہ کاروبار بھی جاری رہتا ہے۔ سب سے بڑی بات اسلام نے جب منع نہیں کیا تو آپ کون ہوتے ہیں۔ اس پر پابندی لگانے پر۔ ویسے بھی شہر میں اور کونسی تقریبات حکومت کر رہی ہے۔ سب پر تو پابندیاں ہیں۔ مگر عملی طور پر انتظامیہ کی سرپرستی میں سب کام ہو رہا ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا ''جس کا دسترخوان جتنا بڑا ہوگا اس پر اللہ تعالیٰ کی اتنی ہی رحمتیں نازل ہوں گی۔'' پہلے زمانے کے بادشاہ تو لنگر خانے بناتے تھے تاکہ کوئی غریب بھوکا نہ رہے۔ ہماری حکومت اگر خود نہیں کھلا سکتی تو کم از کم دوسروں کو تو کھلانے دے۔ اسی بہانے بہت سے غریب رشتہ دار جو گھروں پر دال چٹنی کھاتے ہیں ان موقعوں پر خوب رچ کر کھانے کھاتے ہیں اور یقیناً کھلانے والے کو دعائیں دیتے ہیں۔ سعودی عرب میں تو اگر آپ کے پاس شادی کے پیسے نہیں ہیں تو حکومت اعانت کرتی ہے کیا ہمارے ہاں ایسا کوئی قانون ہے ہم ٹیکس پر ٹیکس وصول کرنے پر بڑی پھرتی دکھاتے ہیں۔ عوام کو ہم کیا دے رہے ہیں۔ کون سی

تفریح ہے جس پر ہم نے ٹیکس نہیں لگایا۔ کونسی ہم نے عوام کو سہولتیں دی ہیں۔ خدارا کسی بہانے تو عوام کو تفریح کرنے دو۔ آج پابندی پر عمل کروانے والے بتائیں کہ خود انہوں نے اپنے شادی کے موقع پر کیا نہیں کیا تھا۔ سادگی اپنانی ہے تو پہلے خود اپنائیں۔ پھر عوام کی طرف آئیں۔ بیس بیس ایکڑ پر صدر، وزیراعظم، گورنر ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ کروڑوں روپے صرف ان کے کھانے کا بجٹ ہے، وہاں کیوں سادگی نظر نہیں آتی۔ صرف شادی کی تقاریب میں کھانا نہ کھانے سے سادگی آجائے گی۔

میرا حکومت کو یہی مشورہ ہے کہ شادی کی تقاریب پر کھانے کی پابندی اٹھالینی چاہئے۔ ویسے بھی ہماری معیشت اس سردار جی کے کبڑے لڑکے کی طرح ہے جو اوپر کا بٹن نیچے والے خانے میں لگائے گھوم رہا ہے۔ ہم آئی ایم ایف، ورلڈ بینک سے قرضے لینے میں تو عار محسوس نہیں کرتے اپنے فضول اخراجات کم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر کھانے پر پابندی برقرار رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ کاش یہ حکومت ان اخراجات کا حساب کتاب مانگے جب افغانستان جیسا ملک بغیر قرضے چل سکتا ہے تو ہم کیوں بغیر قرضے لئے اپنا ملک نہیں چلا سکتے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو دنیا کی تمام نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ کیا نہیں ہے ہمارے ملک میں۔ پیٹرول، گیس، معدنیات، سرسبز زمین، پہاڑوں کا سلسلہ، کون سا پھل ہم نہیں پیدا کر رہے ہیں۔ صرف اوپر کا بٹن نیچے سے نکال کر سیدھا کر لیں تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔